چاک کا بوسیدہ ٹکڑا

(افسانے)

ایم۔ اے۔ کنولؔ جعفری

چاک کا بوسیدہ ٹکڑا

ایم۔ اے۔ کنولؔ جعفری

چاک کا بوسیدہ ٹکڑا

(افسانے)

ایم۔ اے۔ کنولؔ جعفری

رابطہ

۲/۱۲۷ جامع مسجد، نیندڑو،

تحصیل دھام پور، ضلع بجنور (یو پی) ۲۴۶۷۶۱

Cell Phone: 9917767622, 9675767622

E-mail: jafrikanwal785@gmail.com

کتاب : چاک کا بوسیدہ ٹکڑا (افسانے)
مصنف : ایم۔اے۔کنولؔ جعفری
تعداد : 500
مطبع : ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔
ناشر : ایم۔آر۔پبلی کیشنز
10 میٹرو پول مارکیٹ، 2724-25 کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

Chalk Ka Boseeda Tukra

(Short Stories)

by

M. A. Kanwal Jafri
127/2 Jama Masjid, Neendru,
Tehsil: Dhampur, District: Bijnor (U.P.) 246761
Cell Phone: 9917767622, 9675767622
E-mail: jafrikanwal785@gmail.com

ISBN: 978-81-

First Edition : 2019
Price: ₹ **133/-**

"یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔شائع شدہ مواد سے اردو کونسل کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔"

Printed & Published by
M. R. Publications
Printers, Publishers, Book Sellers & Distributors of Literary Books
10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002
Cell: 09810784549, 09873156910, 8368305471 (Whatsapp)
E-mail: abdus26@hotmail.com

○

شریک حیات

فاطمہ خاتون

کے نام

جو شعر کہنے اور افسانے لکھنے کے دوران
کبھی رکاوٹ نہیں بننے کے علاوہ
زندگی کی آخری ساعتوں تک میری معاون و مددگار
اور ترغیب و رہنمائی کا باعث بنی رہی۔

○○

فہرست

○○

حرف حرف آئینہ

اسکول کے سرٹیفکٹ کے مطابق میرا جنم 2 جنوری 1952ء کو مسلم اکثریت کے قصبہ نینڈرؤ خاص، تحصیل دھام پور، ضلع بجنور (اُتر پردیش) میں ہوا۔ یہ دھام پور دہلی قومی اسٹیٹ شاہراہ پر دھام پور سے پانچ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ والد محترم عبدالصمد نے محبوب احمد نام رکھا۔ پانچ برس کی عمر میں جامع مسجد کے مدرسہ سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ قرآن مقدس مکمل کرنے کے بعد پرائمری اسکول میں داخل کرایا گیا۔ ہیڈ ماسٹر عبدالحمید صاحب نے معلومات عامہ کے کئی سوال پوچھنے کے بعد دوسری جماعت کے رجسٹر میں نام درج کیا۔ پانچویں کے بعد 1962ء میں چھٹی کلاس میں داخلے کے لئے تین کلو میٹر کی دُوری پر واقع گاؤں منکوا کے گاندھی جونیئر ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ 1965ء میں مڈل کرنے کے بعد دھام پور کے رنجیت سنگھ میموریل انٹر کالج سے 1968ء میں ہائی اسکول اور 1970ء میں انٹرمیڈیٹ کی تعلیم مکمل کی۔ اقتصادی حالات نے مزید تعلیم پر بریک لگا دیا۔

پڑھے لکھے خاندان سے تعلق ہونے کی وجہ سے زیادہ تر افراد سرکاری و نیم سرکاری محکموں میں ملازم تھے۔ گھر کا ماحول تعلیمی تھا۔ خواتین کے پاس محلے پڑوس کی لڑکیاں قرآن کریم کے ساتھ اُردو و ہندی کی تعلیم حاصل کرنے آیا کرتی تھیں۔ پھوپا زاد بھائی محمود ظفر کالج میں لیکچرر اور تایا زاد بھائی عبد الوحید قمر، ڈاکٹر اقبال احمد تاج،

ظفر جمیل ظفر اور محمد طاہر نجیب آبادی شاعر تھے۔ تایا زاد بھائی خورشید عالم کو ناول و کتب بینی کا شوق تھا۔ اُنہوں نے ''اُردو لائبریری'' قائم کر رکھی تھی۔ اِس سے لوگ استفادہ کرتے تھے۔ تایا زاد بھائی محمد طیب اور بھتیجے وصال احمد اردو اَدبی رسالے ماہنامہ ''شمع'' دہلی میں شائع ہونے والے معمے بھرنے کے شوقین تھے۔ اِس شوق سے راقم بھی خود کو مبرّا نہ رکھ سکا۔ اِسی درمیان قلب شعر گوئی کی طرف مائل ہو گیا۔ کنولؔ تخلص اختیار کیا۔ ۸؍جولائی ۱۹۷۱ء کو جناب نشترؔ خانقاہی کی ادارت میں بجنور سے شائع ہونے والے ہفت روزہ اردو اخبار ''حرارت'' میں کنولؔ نینڈروی کے نام سے پہلی مرتبہ تین شعر شائع ہوئے۔ افسانہ لکھنے میں بھی طبع آزمائی کی۔ پہلا افسانہ ''طوفاں طوفاں ساحل ساحل'' فروری ۱۹۷۳ء میں ''خاتونِ مشرق'' دہلی اور مارچ ۱۹۷۳ء میں ''حسن وصحت'' کلکتہ میں شائع ہوا۔

منکوا کا گاندھی جونیئر ہائی اسکول، ہائیر سیکنڈری اسکول ہو چکا تھا۔ ایک روز ہیڈ ٹیچر اور مشفق اُستاد محترم دھیان سنگھ نے اسکول بُلا کر بی۔ٹی۔سی۔ کی ٹریننگ کر بہ حیثیت اُردو ٹیچر اسکول میں درس و تدریس کا کام انجام دینے کا مشورہ دیا، لیکن دل اس طرف مائل نہیں ہوا۔ اگلے برس دوبارہ ٹریننگ کر اسکول میں اُردو پڑھانے کی ذمہ داری سنبھالنے کو کہا گیا۔ اِس مرتبہ اُستاد کے حکم کو ٹالنا ناگزیر ہو گیا۔ بی۔ٹی۔سی کی ٹریننگ کے بعد گاندھی ہائیر سیکنڈری اسکول منکوا میں اسٹنٹ ٹیچر کی اسامی منتظر تھی۔ آخرکار 10 اکتوبر 1975ء کو سروس جوائن کر لی۔

ٹیچر کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد جہاں شعر گوئی اور افسانے لکھنے کا شوق بڑھا، وہیں مزید تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ بھی اُبھر آیا۔ ضلع سے شائع ہونے والے اُردو کے ہفتہ واری اخبار ''خضرِ حیات'' نجیب آباد، ''حرارت'' بجنور، ''تصویرِ بجنور'' اور ہندی روزنامچے ''بجنور ٹائمز''، ''اُتر بھارت ٹائمز''، ''چنگاری'' اور ''راشٹر

ویدنا'' وغیرہ میں بطور نامہ نگار کام کیا۔ میرٹھ سے چھپنے والے ہندی روزنامہ ''پربھات'' اور ''مہ راشٹر''، بڑوت کے ہفتہ وار ''جن پرسون''، دہرہ دون کے ''دون درپن''، سہارنپور کے ''سہارنپور درپن'' اٹاوہ کے ''دِن رات'' اور ''سویرا'' بلند شہر کے ''برن دُوت'' بریلی کے ''آج'' اور ''نوستیم'' کے علاوہ ملک کے دارالخلافہ دہلی سے شائع ہونے والے روزنامہ ''نوبھارت ٹائمز'' اور ''ہندوستان'' کو بھی علاقائی خبریں ارسال کیں۔ اُردو کے روزنامچہ ''پیغام''، ''اِندنوں''، ''ہمارا سماج''، ''صحافت''، ''اخبارِ مشرق''، ''راشٹریہ سہارا'' اور ''انقلاب'' کے لئے بھی خبریں بھیجنے کا سلسلہ جاری رہا۔ میرٹھ سے شائع ہونے والے ہندی روزنامہ ''جاگرن'' اور ''امر اُجالا'' میں خبررساں کے طور پر کام کیا۔ اُردو کے اخبار ''اخبار مشرق'' اور ''انقلاب'' کے علاوہ ہندی روزنامہ ''امر اُجالا'' سے ابھی بھی جُڑا ہوں۔

حالانکہ میری کہانیاں، غزلیں، نظمیں اور مضامین ماہنامہ ''مشرقی خاتون'' دہلی، ہفت روزہ ''پیام مشرق'' دہلی، ''خضرِ حیات'' نجیب آباد، ماہنامہ ''سحبان الہند'' دہلی، ماہنامہ ''سب رنگ'' اُردو ڈائجسٹ دہلی، ماہنامہ ''حسن وصحت'' کلکتہ، پندرہ روزہ ''ماہی گیر'' رامپور، ہفت روزہ ''ایمرجنسی مشن'' چاندپور روزنامہ ''قومی جنگ'' رامپور، روزنامہ ''پرتاپ'' دہلی اور ماہنامہ ''گلکدہ'' سہسوان وغیرہ میں شائع ہوتی رہیں۔ لیکن مجھے یہ کہنے میں قطعی ہچک نہیں کہ ہندی اخبارات کے لئے نامہ نگاری کرنے کے علاوہ ہندی اخبار و جرائد کے لئے مضامین لکھنے کے سبب رفتہ رفتہ اُردو سے دُوری ہوتی گئی۔

حالانکہ ٹیچنگ کے میدان میں قدم رکھنے سے قبل 1972ء میں جامعہ اُردو علی گڑھ سے ادیب ماہر اور 1973ء میں ادیب کامل کر چکا تھا۔ جرنلزم کا کورس بھی کیا۔ دَوران تدریس 1977ء میں روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی سے گریجویشن کے علاوہ آئی جی

ڈی بابے کا امتحان دیا۔ روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی سے 1979ء میں اُردو سے پوسٹ گریجویشن کیا۔ کئی برس بعد اسی یونیورسٹی سے 1986ء میں انگریزی سے ایم اے کی ڈگری لی۔ ہندی میں تخلیق کاری جاری تھی۔ درس و تدریس کا کام بھی کب تک چلتا۔ آخرکار 30 جون 2012ء کو گاندھی انٹر کالج منکوا سے رٹائر ہو گیا۔ حالات جیوں کے تیوں رہے۔ 2015ء شروع ہو چکا تھا۔ ایک دن اچانک خیال آیا کہ جانے انجانے میں اُردو سے دُوری کے سبب میں نے اُردو کے ساتھ جو ناانصافی کی ہے، اُس کے لئے اُردو اَدب مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ چار دہائی سے زیادہ کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ طویل عرصہ میں ہوئے نقصان کی تلافی ممکن نہیں ہے، مزید وقت برباد کئے بغیر پھر سے اُردو میں طبع آزمائی شروع کی۔ دوسری اننگس کی پہلی کہانی، ''فرسودہ رواجوں کا درد'' اُردو اکیڈمی دہلی کے مشہور و معروف اَدبی جریدے ماہنامہ ''ایوانِ اُردو'' کے مئی 2015ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ ماہنامہ ''اُردو دُنیا'' نئی دہلی، ماہنامہ ''خواتین دُنیا'' نئی دہلی، ماہنامہ ''آج کل'' نئی دہلی، ماہنامہ ''شاعر'' ممبئی، دو ماہی ''فکرِ نو'' لاہور (پاکستان) ''لاریب'' لکھنؤ، ماہنامہ ''جہاں نما'' گنگوہ، ماہنامہ ''زریں شعاعیں'' بنگلور، ماہنامہ ''تریاق'' ممبئی، دو ماہی ''گلبن'' لکھنؤ، دوماہی ''اِنشاء'' کولکاتہ، سہ ماہی ''تحریک اَدب'' بنارس، روزنامہ ''اخبار مشرق'' دہلی، روزنامہ ''انقلاب'' دہلی اور روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' دہلی وغیرہ میں کئی غزلیں، کہانیاں، دینی اور ادبی مضامین شائع ہونے کے ساتھ یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ اُردو میں پھر سے شعرگوئی، افسانہ نگاری اور مضمون نگاری کا سلسلہ شروع ہونے سے کسی حد تک اطمینان ہے۔

دوستوں کے اصرار پر کچھ نئے اور کچھ پرانے افسانوں کو جمع کر کتابی شکل میں پیش کرنے کا ارادہ ہوا۔ زیرِ نظر کتاب ''چاک کا بوسیدہ ٹکڑا'' بیس افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۵ء کے بیچ شائع ہونے والے آٹھ

افسانوں میں ''پیاسی محبت، پاگل سپنے، آگ کا دریا، احساس، پانچواں رُوپ، کھوٹے سکے، طوفاں طوفاں ساحل ساحل'' اور ''کاغذ کا پھول'' شامل ہیں۔ کتابت کی غلطی کی وجہ سے کہیں کہیں برائے نام ترمیم بھی کی گئی ہے۔ مجموعہ میں شامل باقی بارہ افسانے ۲۰۱۵ء سے ۲۰۱۸ء کے درمیان ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

OO

— ایم۔ اے۔ کنولؔ جعفری

ایم۔اے۔ کنولؔ جعفری اپنے افسانوی مجموعہ

"چاک کا بوسیدہ ٹکڑا" کے آئینہ میں

ساری تعریف اُس خالق دو عالم کے لئے ہے جس نے اولادِ آدم کو بہترین عقل وفہم دے کر دیگر مخلوقات سے اشرف بنایا اور طاقتِ گویائی کے ساتھ اس کو قلم سے بھی روشناس کرایا تا کہ وہ خود بھی زبان وقلم سے اس کی حمد اور عمل سے فرمانبرداری کرتا رہے نیز اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو بھی اپنے قول وفعل اور قلم سے اس کی مرضیات پر چلنے کی ترغیب دیتا رہے۔ ادب چاہے شعری ہو یا نثری اگر وہ مذکورہ مقصدیت سے عاری ہے اور معاشرہ میں پھیلی گندگی کو صرف آئینہ دکھانے کا کام کرتا ہے اس کو دور کرنے کا کوئی نُسخہ تجویز نہیں کرتا، یعنی اپنے قاری کی کوئی اخلاقی تربیت نہیں کرتا تو ایسا ادب ذہنی عیاشی سے زیادہ کچھ کہلانے کا قطعی مستحق نہیں۔ ناول ہو یا افسانہ وہ اسی وقت اچھا کہلائے گا جب دن بھر کے تھکے ماندے انسان کی نہ صرف ذہنی تھکاوٹ دور کرے بلکہ اس کی کردار سازی کا رول بھی ادا کرے۔ اگر اس نے اپنے قاری کو صرف اپنے گرد وپیش پھیلی ہوئی غلاظتوں سے آگاہ کرانے پر اکتفا کی تو گویا ادھورا فرض نبھایا بلکہ غیر محسوس طور پر قاری کو یہ تاثر دیا کہ جب مجھ جیسے دوسرے افراد اس برائی میں مبتلا ہیں تو میرے لئے بھی اس کو اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ راقم السطور کا خیال ہے کہ کسی افسانہ یا ناول میں اگر کوئی واضح اصلاحی پیغام

نہیں ہے محض معاشرہ میں موجودہ کسی ظلم، عریانیت یا فحاشی کا ذکر ہے تو وہ بھی اپنے قاری کے ذہن کو اسی طرح پراگندہ کرتی ہے جس طرح آج کے ٹی وی اور سنیما کے عریاں اور فحش پروگرام دیکھنے والوں کے اذہان پر منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا تمہید کے بعد آئیے! ایم اے کنولؔ جعفری کے ذریعہ ''چاک کا بوسیدہ ٹکڑا'' نامی مجموعۂ میں شامل افسانوں پر ایک نظر ڈال لیں۔ بندہ کے حافظہ کے مطابق خاکسار ایم اے کنولؔ جعفری کے نام سے مئی ۲۰۱۵ء کے ماہنامہ ''ایوانِ اردو'' میں شائع افسانہ بعنوان ''فرسودہ رواجوں کا درد'' پڑھ کر آشنا ہوا تھا۔ اس وقت اُن کے پتہ میں نینڈڑو، تحصیل دھام پور لکھا دیکھ کر ایک گونہ مسرت بھی ہوئی تھی کہ ہر قسم کے ظلم و ستم کو جھیل چکی اُردو زبان کو دشمنان اُردو کتنا ہی دفن کرنا چاہیں یہ ہرگز مرنے والی نہیں کیوں کہ نینڈڑو نام کی غیر معروف اور چھوٹی سی بستی میں اس کی ہستی کے چراغ کو خون جگر جلا کر زندہ رکھنے والا مرد مجاہد موجود ہے۔ عجب اتفاق کہ ایم اے کنولؔ جعفری نے اس اوّلین افسانوی مجموعہ کی ابتدا بھی ''فرسودہ رواجوں کا درد'' سے ہی کی ہے۔ اس کا موضوع نیا تو نہیں ہے لیکن لب ولہجہ اور بیانیہ دوسرے افسانہ نگاروں سے علیٰحدہ ضرور ہے۔ ہڈی سے ہڈی اور چمڑی سے چمڑی ملانے کے دکھاوٹی رواج نے لڑکیوں کی شادی کو کس قدر دشوار بنا دیا ہے اس کی عمدہ مصوری اس افسانہ میں کی گئی ہے۔

دوسرے افسانہ کا عنوان ''بازگشت'' ہے جس کی روح یہ ہے کہ جیسا برتاؤ تم اپنے والدین کے ساتھ کرو گے اسی طرح کا برتاؤ تمہاری اولاد تمہارے ساتھ کرے گی۔ یہ پلاٹ بھی اچھوتا نہیں ہے اور ''جیسی کرنی ویسی بھرنی'' عنوان یا اس سے ملتے جلتے عنوان سے دیگر افسانہ نگاروں کے یہاں بیان کیا جا چکا البتہ کنولؔ جعفری کا انداز قدرے جداگانہ ضرور ہے۔ افسانہ ''دوکھی'' کا عنوان بھی نیا ہے اور اس کا پلاٹ بھی دلچسپ ہے۔ دنیا کے دھنا سیٹھ اپنی وجاہت اور پیسے کے زور پر سماج کے گرے پڑے طبقہ پر روزِ ازل سے ظلم وستم کرتے آئے ہیں اور اُن کے حقوق کی پامالی کرتے رہے ہیں لیکن اس کہانی میں ایک غریب شخص کو گاؤں کی پنچایت کے ذریعہ گئو ہتیہ کا

دوکھی (دوشی یا گنہگار) قرار دے کر ایک ہفتہ تک بھیک منگوائی گئی ہے اس کا تصور ایک شہری قاری کے لئے بالکل اچھوتا ہے۔ کنولؔ جعفری نے اس کو کس انداز سے بیان کیا ہے، نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

''رمیش پیشہ ور گدا نہیں تھا۔ اُس کے لئے گھر گھر جا کر بھیک مانگنا کافی کٹھن تھا۔ وہ پہلے دن خود کو بڑی مشکل سے تیار کر پایا تھا۔ اگر اُسے نرک میں جانے کا خوف نہ ہوتا تو وہ کسی بھی صورت میں گداگری اختیار نہ کرتا۔ دھرم کی کسوٹی اور سماجی ٹھیکیداروں کے ذریعہ گھڑے گئے قوانین کے آگے عام شخص کی کوئی حیثیت نہیں۔''

''اکیوریم میں قید ماہی'' افسانہ کا عنوان ہی قاری کو چونکانے کے لئے کافی ہے۔ شہر کے ماحول میں پلی بڑھی لڑکی دیہات کی سسرال میں جا کر کس طرح پریشان ہوتی ہے اس کی بڑی عمدہ عکاسی اس کہانی میں کی گئی ہے لیکن آخر کار ''محبت فاتح عالم'' کے مصداق وہ اپنے سسرالی اعزہ کی محبتوں کے آگے اس قید و بند کو بخوشی قبول کر لیتی ہے۔ راقم نے جب عنوان پر غور کیا تو کنولؔ جعفری کی حسِ لطیف کا قائل ہونا پڑا۔ اکیوریم انگریزی یا لاطینی زبان کا لفظ ہے اور ایک طرح سے مغربی دنیا کی عیش پرستانہ زندگی کا استعارہ ہے جبکہ ماہی فارسی زبان کا لفظ ہے اور مشرقی عوام کی مخلصانہ رواداریوں اور سادہ زندگی کی نشاندہی کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ ''نوکرانی'' میں ایک ایسی مسلم عورت کا کردار پیش کیا گیا ہے جو باوجود عسرت اور غربت کے ایماندار اور دیانتدار ہے۔ مذہبی منافرت کی چاشنی نے اس افسانہ کے حُسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ آپ بھی لطف اندوز ہوں۔

''بیٹی کرن! تیری نوکرانی تو پرتیک کاریہ آرمبھ کرنے سے پورو کچھ ایسے شبدوں کا اُچارن کرتی ہے جو صرف مسلمانوں کے مُکھ سے سُنے جاتے ہیں۔ یہ تو مجھے مسلمان لگے ہے۔''

''ہاں ماں! سیما مسلمان ہے۔ بہت نیک، ایماندار اور بھروسہ کی عورت۔''

کرن نے ماں سے سیما کی تعریف کی۔

''اگر مجھے پتہ ہوتا کہ تو نے گرہ کاریہ کے لئے دھرم بھرشٹ کرنے والی نوکرانی رکھ لی تو میں تیرے گھر کدابی پدارپن نہ کرتی۔'' ماں جی نے اپنے من کی بات کہہ دی۔

کنول جعفری نے اس افسانوی مجموعہ کا نام ''چاک کا بوسیدہ ٹکڑا'' ایک دلچسپ افسانے کے عنوان پر رکھا ہے۔ اس افسانہ میں ایک ایسے ریٹائرڈ ہو چکے ماسٹر کی بے بسی اور محرومی کا نقشہ کھینچا گیا ہے جس کی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے اور جس کی بہوئیں اُس کو ایک ملازم کی طرح گھر کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو خرید کر لانے کے لئے بار بار بازار کے چکّر کٹواتی ہیں اور نالائق بیٹے بھی خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں۔

کنولؔ جعفری کے تمام افسانوں میں یہ صفت ہے کہ وہ قاری کو آخیر تک اپنے ساتھ باندھے رکھتے ہیں کم وبیش نصف افسانوں کا پلاٹ بھی نیا ہے اور تکنیک بھی انوکھی ہے۔ لیکن اُن کے کسی افسانے میں فی زمانہ شاہکار کہلائے جانے والے افسانوں مثلاً ''لحاف''، ''ٹھنڈا گوشت'' اور ''کھول دو'' جیسے افسانوں میں موجود عریانیت اور جنسی ہیجان کا کوئی شائبہ نہیں البتہ ہر افسانہ اپنے اندر ایک واضح پیغام ضرور رکھتا ہے۔ قوی امید ہے کہ اس مجموعہ کے افسانے اپنے قاری کے اخلاقی جوہروں کو ابھارنے میں مؤثر رول ادا کریں گے۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ ایم اے کنولؔ جعفری کا قلم اسی طرح رواں دواں رہے، اس میں مزید نکھار پیدا ہو اور وہ معاشرہ کی اصلاح کا فریضہ ادا کرتا رہے۔ وما توفیقی اِلّا باللہ.

○○

مورخہ: ۱۷/اگست ۲۰۱۸ء
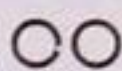
ـــ ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی، لکھنؤ
موبائل: 9307065182

افسانے
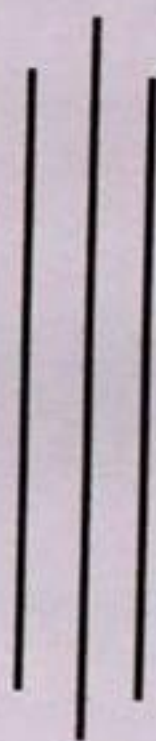
چاک کا بوسیدہ ٹکڑا

فرسودہ رواجوں کا دَرد

صادِق کو کھانسی کے ساتھ ضیق النفس(Bronchitis) کا مرض تو تھا ہی، لیکن پچھلے کئی مہینے سے اُس کا سانس بھی کافی پھولنے لگا تھا۔حالانکہ بیوی نسیمہ اپنے شوہر کی دَوادارو اور خدمت کا پورا خیال رکھتی تھی، مگر گزشتہ کئی روز سے وہ بیٹے سلیم، اُس کی بیوی سعدیہ، پوتے شارق اور پوتی شگفتہ کو کچھ زیادہ ہی یاد کر رہے تھے۔ ملازمت سے فراغت کے بعد سے اُن کا زیادہ تر وقت گھر پر رہ کر اخبار و رسائل پڑھنے میں ہی گزرتا تھا۔

سلیم اتر پردیش کے دارُالخلافہ لکھنؤ میں سرکاری دفتر میں بطور افسر کام کرتا تھا۔کام کی کثرت اور ذمہؔ داری کی وجہ سے اُس کا اپنے گھر پر آنا جانا کم ہی تھا۔ سلیم بیوی بچّوں کے ساتھ کئی بار ممی پاپا سے ملنے اور کُچھ روز اُن کے ساتھ رہنے کا پروگرام بنا چکا تھا، لیکن ہر بار دفتر میں کام کی زیادتی سب سے بڑی رُکاوٹ بن جاتی تھی۔ اِس کے علاوہ ایک دِقّت یہ تھی کہ سب کو ساتھ جانے کے لئے اسکول سے بچّوں کی چھٹّی بھی ساتھ ہی چاہئے تھی۔آجکل کے چکّر میں گھر جانا ٹلتے ٹلتے دو سال گذر گئے۔

کُفر ٹوٹا خدا خدا کر کے کے مصداق آخر ایک دِن گھر جانے کا پروگرام بن ہی گیا۔ سلیم کو دفتر سے پورے دو ہفتہ کی چھٹّی منظور ہوگئی تھی۔اُس کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بچّوں کے ساتھ رات کی گاڑی سے گھر کے لئے روانہ ہوگیا۔صبح قریب سات بجے ٹرین نے اُنہیں اُن کے شہر پہنچا دیا۔سلیم کو رِکشہ سے گھر پہنچنے میں

مشکل سے بیس منٹ لگے۔

سلیم نے رِکشہ والے کو کرایہ دیا اور دونوں ہاتھوں میں سوٹ کیس اُٹھائے گھر میں داخل ہو گیا۔ سعدیہ اور دونوں بچّے بھی پیچھے پیچھے اندر آ گئے۔

اسلام علیکم امّی ابّو۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی سلیم نے بے حد خوشگن انداز میں زوردار سلام کیا۔

'وعلیکم السلام! آؤ بیٹے آؤ'۔ ماں نسیمہ اور باپ صادق دونوں نے ایک ساتھ سلام کا جواب دیتے ہوئے ڈھیر ساری دُعائیں دیں۔ ماں نے اپنی بہو کو گلے سے لگایا اور بچّوں کو پیار کرتے ہوئے گود میں بیٹھا لیا۔

باپ نے بھی دُعاؤں سے نوازا۔ شارق و شگفتہ کو اپنے پاس بیٹھا کر دیر تک پیار کیا۔ وہ بہت خوش تھے۔ گویا بیٹے، بہو اور پوتا پوتی کے آنے سے اُن کا تمام مرض اکدم کٹ سا گیا ہو۔ حال چال جاننے کے لئے کافی دیر تک گفت وشنید کے باوجود صادق کا سانس نہیں پھولا۔ وہ کبھی بچّوں کے ساتھ بات چیت میں مشغول ہو جاتے، تو کبھی بہو بیٹے کو اپنے مرض کی تفصیل اور دوا کے استعمال کی جانکاری بتانے لگتے۔ پل بھر میں سُونے گھر کا ماحول پوری طرح بدل گیا تھا۔ ہر طرف خوشی ہی خوشی کا ماحول تھا۔

ہنسی خوشی کے ساتھ کئی دن گذر گئے۔ اِدھر ماں، بہو اور بیٹے کی باتیں ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں، اُدھر دادا، اپنی پوتی پوتے کے ساتھ اپنی دُنیا میں مگن تھے۔ صادق اُنہیں کبھی پریوں کی کہانیاں سناتے اور کبھی اُن سے اُن کے کورس کی کتابوں میں درج پیاری سی کہانی سنتے۔ کبھی گھر کی باتیں پوچھتے اور کبھی اسکول میں پڑھائی کی۔ کبھی ماں باپ کے سلوک اور پیار کے حالات کی جانکاری لیتے، تو کبھی دوستوں کے بارے میں معلومات کرتے۔

دراصل ایک دوسرے سے اتنی قربت کی ایک وجہ جہاں پورے خاندان کا دو سال کے طویل عرصے کے بعد ایک ساتھ مجتمع ہونا تھا، وہیں دُوری کے باوجود دِلوں میں اپنائیت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اُنہیں جدا نہیں ہونے دے رہا تھا۔

ایک دِن سلیم اپنے کمرے میں اکیلا لیٹا تھا۔اُس کی نگاہ بند الماری پر پڑی۔ اچانک اُسے کچھ یاد آیا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔اُس کے قدم خود بخود الماری کی طرف بڑھ گئے۔

ماضی کی یاد نے اُسے الماری کھولنے پر مجبور کر دیا۔الماری نے ہی اُسے نازِش کی یاد دِلا دی۔ایک عرصہ بعد اچانک آئے نازش کے خیال کے ساتھ سلیم نے الماری کھول دی۔

تعلیم کے دِنوں کی کاپی کتابیں الماری میں جیوں کی تیوں رکھی تھیں۔اِن کتابوں میں ہائی اسکول ڈرائنگ کی وہ نوٹ بک بھی تھی،جس میں بنائے ایک خاکہ نے اُس کی دُنیا میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ وہ پیار کی ایسی حسین وادیوں میں گُم ہو گیا، جہاں سے نکلنا آسان نہیں تھا۔ سعدیہ سے شادی اور دو بچّوں کا باپ بن جانے کے باوجود آج پھر نازش کی یاد آجانا اِس بات کا ثبوت تھا کہ وہ نازش کو ابھی بھی پوری طرح سے بھول نہیں پایا ہے۔

وہ ہائی اسکول میں تھا۔کلاس میں نازش نام کی ایک دُبلی پتلی خوبصورت لڑکی تھی۔ ایک ہی درجہ میں پڑھنے کی وجہ سے اُن میں آپس میں اکثر گُفتگو ہوتی رہتی تھی۔ یہ گُفتگو اُنہیں اتنا نزدیک لے آئے گی، سلیم کو اِس کا اندازہ بھی نہیں تھا۔آنکھیں ملتیں، بات چیت ہوتی،لیکن دِل کی بات زبان پر آنے سے ہمیشہ کتراتی رہتی۔

کلاس میں ایک دِن ڈرائنگ کا ٹیسٹ تھا۔ٹیچر نے اپنی سمجھ سے کوئی خاکہ بنانے اور اُسے نئے انداز سے سجانے کو کہا تھا۔

ڈرائنگ میں نازش نے بہت خوبصورت جھونپڑی بنائی تھی،جبکہ سلیم نے شادی کارڈ کے لفافے کے پُرکشش نمونے کو قرطاسِ ابیض پر اُتارا تھا۔تصویر میں دِل کی دو نُمایاں شکلیں بنائی گئی تھیں۔ملفوف کا ڈِیزائن تیار تھا،لیکن پھر بھی کچھ اُدھورا سا لگ رہا تھا۔

سلیم خیالوں میں کھو گیا۔اور جب خیالی دُنیا سے واپس لوٹا،تو اُس نے اُوپر

کے دِل میں اپنا اور نیچے کے دِل میں نازش کا نام لکھا پایا۔ وہ چونک گیا، لیکن یہ تو اُس نے ہی لکھا تھا۔ کیا کرے؟ اِسے مٹا دے یا رہنے دے۔ "Saleem weds Nazish" کی شوخ عبارت نے اُس کے چہرے کا رنگ گلنار کر دِیا تھا۔ اپنے ہونٹوں پر چنچل مُسکراہٹ لئے وہ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ 'کیا یہ ممکن ہے؟'

وہ اپنے خیالوں کے تانے بانے میں گم تھا۔ تبھی نازش نے اُس کے نزدیک آتے ہوئے پوچھا، 'سلیم تم نے کیا بنایا ہے؟ مجھے بھی دِکھاؤ۔' نازش کی مداخلت سے سلیم کا دھیان ٹوٹ گیا۔

'کُچھ نہیں، کُچھ نہیں۔ میری ڈرائنگ ابھی اَدھوری ہے۔ ابھی تاریخ لکھنی باقی ہے۔' سلیم نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

'تاریخ! کیسی تاریخ؟' نازش نے پوچھا۔

سلیم نے جلدی سے اپنی ڈرائنگ میں بنے نیچے کے دِل سے نازش کا نام مٹانے کی کوشش کی۔ تبھی نازش نے سلیم کے ہاتھ سے ڈرائنگ کی کاپی چھین لی۔ کاپی میں بنائی گئی تصویر دیکھ کر وہ چونک گئی۔ کاپی پر شادی کارڈ کا نمونہ بنا تھا۔ چونکنے کی وجہ اُس پر انگریزی میں 'Saleem weds Nazish' لکھی عبارت تھی۔ اُس کے گلابی چہرے کا رنگ کُچھ تیز ہو گیا۔ حالانکہ نیچے کے دِل میں لکھا نازش کا نام کافی حد تک مٹ سا گیا تھا، لیکن نقُوش کی گہرائی ابھی بھی موجود تھی۔

نازش کے چہرے پر ٹھہراؤ تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے نازش نے ڈرائنگ کی کاپی سلیم کو واپس کر دی۔ اِس سے پہلے کہ نازش کچھ کہتی، سلیم نے آنکھیں چُراتے ہوئے کہا، 'معاف کرنا نازش۔ تمہارا نام کب اور کیسے لکھا گیا؟ مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔''

نازش چلی گئی۔ اُس نے کوئی کمنٹ نہیں کیا۔ سلیم کئی دِن تک نازش سے نظریں نہیں ملا سکا۔ نازش بھی کچھ کٹی کٹی سی رہنے لگی۔ کبھی نگاہیں مل بھی جاتی، تو دونوں جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے۔ اِسی طرح ایک ہفتہ گذر گیا۔ خاموشی کے ساتھ۔

ایک دِن سلیم نے نازش کو اپنے گھر دیکھا۔اُسے لگا کہ وہ امّی سے اُس کی شکایت کرنے آئی ہے۔وہ مجرم کی طرح کھڑا تھا۔تبھی نازش نے اپنے بیگ سے ایک کتاب نکالی اور بڑی خاموشی سے اُس کی طرف بڑھادی۔ کتاب سلیم کی تھی۔

کچھ دِن پہلے وہ اپنا ادھورا کام پورا کرنے کے لئے سلیم سے کتاب لے گئی تھی۔اُس کی جان میں جان آئی۔نازش نے کتاب سلیم کو دیدی اور خاموش قدموں سے واپس چلی گئی۔ دونوں کے بیچ کسی طرح کا کلام نہیں ہوا۔نازش چلی گئی اور سلیم اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔

کتاب میز پر رکھتے وقت سلیم کو محسوس ہوا کہ کتاب کے اندر کچھ ہے۔اُس نے کتاب اُٹھائی۔اُسے کھولا۔ صفحوں کے درمیان ایک خوبصورت فوٹو رکھا تھا۔نازش کا فوٹو۔سلیم کُچھ دیر تک فوٹو کو دیکھتا رہا۔اُسے لگا کہ غلطی سے نازش کا فوٹو اُس کی کتاب میں آگیا ہے۔اُس نے فوٹو پلٹ کر دیکھا۔پُشت پر انگریزی میں، 'I agree with your proposal but after being B.A.' لکھا دیکھ کر وہ دَنگ رہ گیا۔اُس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔اُس نے فوٹو کو کئی بار الٹ پلٹ کر دیکھا۔

دراصل سلیم نازش کو دِل ہی دِل میں چاہتا تھا،لیکن اپنی محبت کا اظہار کرنے کی کبھی جرات نہیں کر سکا تھا۔ اَب اُسے نازش کی چاہت کا بھی علم ہو چُکا تھا۔وہ بہت خوش تھا۔شاید! دُنیا کے سب سے خوش اور خوش قسمت نوجوانوں میں سے ایک۔

آہستہ آہستہ دونوں کے بیچ پیار کا پودا پروان چڑھنے لگا۔پاک محبت کے سہارے دونوں نے بڑی لگن کے ساتھ اپنی پڑھائی جاری رکھی۔ وقت کے جیسے پر لگ گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں نے امتیازی حیثیت سے بی اے کا امتحان پاس کر لیا۔

سلیم کی والدہ نسیمہ کو دونوں کے بیچ گہراتے پیار کی بھنک لگ گئی۔ سلیم نے اِس بارے میں ماں سے کچھ نہیں چھپایا۔نازش نسیمہ کو بھی پسند تھی۔اُس نے اِس محبت پر اپنی رضامندی کی مہر لگا دی۔اَب اُس کا صرف ایک مقصد تھا۔ دونوں کے پیار کو

شادی کے بندھن میں تبدیل کرانا۔

نسیمہ نے اِس بابت اپنے شوہر صادق سے بات کی۔ صادق اپنی حیثیت کو لے کر پہلے تو کچھ جھجکے، لیکن بعد میں اپنے اکلوتے بیٹے کی خوشی کے لئے رضا مند ہو گئے۔

نسیمہ اپنے بیٹے کی آرزو کی تکمیل کے لئے ایک دن نازش کے بنگلے پر جا پہنچی۔ رِسماً سلام و جواب کے بعد نسیمہ نے نازش کی والدہ تہذیب سے اپنے آنے کا مدّعا بیان کرتے ہوئے بیٹے سلیم کے لئے نازش کا ہاتھ مانگا۔

تہذیب نے نازش کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر چمک تھی۔ چہرے پر لکھی عبارت پڑھ کر تہذیب کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ تہذیب نے فوراً حامی بھر لی۔ نسیمہ کو ایسے لگا، جیسے نازش بھی اپنی خواہش کا اظہار اپنی ماں سے پہلے ہی کر چکی تھی۔

بات چیت کا سلسلہ جاری ہی تھا، کہ نازش کے والد عاطف نے گھر میں قدم رکھا۔ نسیمہ نے بڑے ادب سے کھڑے ہو کر اُنہیں سلام کیا۔ سلام کا جواب دے کر عاطف اندر کمرے میں چلے گئے۔ تہذیب نے نسیمہ کے تشریف آوری کی وجہ بتاتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے بیٹے سلیم کے لئے نازش کا ہاتھ مانگنے آئی ہیں۔ نازش اور سلیم دونوں ایک ہی درجہ میں پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں۔

سلیم کے والد کا نام صادق جاننے پر عاطف کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ چہرے پر ناگواری کی لکیریں صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ اُنہوں نے اپنی بیگم سے کہا، آپ شاید صادق کے بارے میں نہیں جانتیں۔ یہ وہی صادق ہے، جو ہماری کمپنی میں کام کرنے والا ایک معمولی افسر ہوا کرتا تھا اور، جسے برسوں پہلے بدعنوانی کے الزام میں کمپنی سے نکال دیا گیا تھا۔ اُنہوں نے یہ کہتے ہوئے کہ صادق کو اپنی بیوی کو ہمارے گھر رشتہ لے کر بھیجنے سے پہلے اپنے اور ہمارے درمیان عہدہ نہ سہی، کم سے

کم حیثیت کے بڑے فرق کو تو دیکھ لینا چاہئے تھا۔ اُنہوں نے بڑی حقارت کے ساتھ اس رِشتہ کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

سلیم کی والدہ کو گہرا جھٹکا لگا۔ اُنہیں عاطف سے ایسے برتاؤ کی امید نہیں تھی۔ دونوں بچّوں کی خوشی کے لئے وہ یہ رِشتہ لے کر آئی تھی۔ عاطف نے ایک ہی جھٹکے میں پیار کے گھروندے کو توڑ ڈالا۔ تہذیب کچھ نہ کہہ سکی۔ نسیمہ شرم سے زمین میں گڑ گئی۔ اُس سے اُٹھنا مشکل ہو گیا۔ آخرکار وہاں سے اُٹھی اور مایوس ہو کر گھر لوٹ آئی۔

عاطف کا شُمار شہر کے دولتمند اشخاص میں ہوتا تھا۔ اُسے ایک بڑی کمپنی کا مینیجنگ ڈائریکٹر ہونے کا فخر بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کم حیثیت والے نزدیکی رشتے داروں کو بھی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ دوسری طرف صادق نیک، خوش مزاج اور صاف گو انسان تھا۔ عاطف کے مقابلے اُس کی حیثیت کا کہیں شمار نہیں تھا۔

سلیم اور نازش کا رِشتہ نہ ہونے کی وجہ صادق کا کم حیثیت ہونا تو تھا ہی، ایک وجہ یہ بھی تھی کہ صادق نے کئی سال تک عاطف کی کمپنی میں کام کیا تھا۔ عاطف اور صادق کا تعلق مالک اور نوکر کی طرح رہنے کے سبب عاطف کو یہ گوارا نہیں ہوا کہ اس کی اکلوتی لاڈلی بیٹی اُس کی کمپنی میں کام کر چکے ایک معمولی نوکر کے بیٹے کے ساتھ بیاہ دی جائے۔

شاید اِسی فرق کے مدِنظر صادق سلیم کے رشتے کا پیغام خود لے کر عاطف کے دولت کدہ پر جانے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ نسیمہ نے نازش اور سلیم کا رشتہ کرانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ دونوں کے سچّے پیار کا حوالہ دے کر اُن کی خوشحال زندگی کے لئے رِشتہ منظور کرنے کے لئے نسیمہ نے عاطف کے سامنے اپنا دامن تک پھیلا دیا تھا، لیکن عاطف نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔ تہذیب کی خواہش اور نازش کا خواب پورا نہیں ہو سکا۔ چند روزہ زندگی کے رُتبہ اور حیثیت کے جنون نے دو پیار کرنے والوں کو شادی کی منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی جُدا کر دیا۔

نسیمہ کے گھر میں قدم رکھتے ہی سلیم نے پُر امید نگاہ سے اُن کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھا، 'ماں! نازش کے ابو، امی مان گئے۔ اُنہوں نے رشتے کے لئے ہاں کر دی نہ!! بتاؤ ماں، اُنہوں نے کیا کہا؟' سلیم نے ایک کے بعد ایک کئی سوال ماں کی طرف اُچھال دِئے۔

'بیٹا! خدا جو کرتا ہے، بہتر ہی کرتا ہے۔ اگر وہ نازش کا رِشتہ ہمارے یہاں نہیں کرنا چاہتے، تو کیا ہوا؟ میں تمہارے لئے اُس سے بھی اچھی لڑکی ڈھونڈ لاؤں گی۔' نسیمہ نے بیٹے کو تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

سلیم کو رِشتہ سے انکار کی قطعی امید نہیں تھی۔ اُس نے ماں سے صاف صاف بتانے کی ضد کی۔ ماں آخر بتاؤ تو سہی، اُنہوں نے کہا کیا ہے؟

سلیم نازش کی امّی تُم دونوں کے رِشتہ سے بہت خوش تھیں، لیکن عاطف نے اپنی بیٹی کی تمام خوشیوں کا گلا گھونٹتے ہوئے صاف انکار کر دیا۔ اُن کے مقابلے ہماری کم حیثیت تمہاری شادی میں آڑے آ گئی۔ عاطف نے اپنی کمپنی میں کام کر چکے صادق کے بیٹے کے ساتھ رِشتہ جوڑنے سے صاف انکار کر دیا۔ اُنہوں نے ہماری غربت کو آئینہ دکھاتے ہوئے بے جھجک کہہ دیا کہ ان کی اکلوتی بیٹی ان کے نوکر کے گھر میں دُلہن بن کر نہیں جا سکتی۔ تہذیب نے عاطف کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ اُن کے انکار سے اپنے کمرے میں بیٹھی نازش بھی رونے لگی، لیکن عاطف نہیں پسیجے۔ اُنہوں نے ایک ہی جھٹکے میں اپنی بیٹی کا خواب توڑ کر چکنا چور کر دیا۔

زبان سے مالک، نوکر، دولت، حیثیت، خاندان ، سماج اور رُتبہ جیسے زہریلے الفاظ ادا کرتے وقت نسیمہ کے چہرے پر آئی کڑواہٹ کو سلیم نے بہت اچھی طرح سے پڑھ لیا تھا۔ اُس نے بے حد سمجھداری کا مظاہرہ کیا۔ اپنے جذبات پر قابو رکھا اور حالات سے سمجھوتہ کر لینے کو ہی مناسب سمجھا۔

سلیم مایوس تھا۔ اُس نے نازش کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کرنے کو لے کر

سُنہرے خواب کا جو تانا بانا بُنا تھا وہ دیکھتے ہی دیکھتے ریت کے گھروندے کی طرح بکھر چکا تھا۔ تبھی ہوا کا تیز جھونکا آیا اور کمرے میں لگا مکڑی کا جالا سمٹ کر ایک سمت گر گیا۔ اُس پر بیٹھی مکڑی بھی جالے کے ساتھ فرش پر جا گری۔ وہ دُکھی اور غمگین رہنے لگا۔ اُسے نازش کی مجبوری کا احساس بھی تھا۔

ماں سے سلیم کا دُکھ دیکھا نہیں گیا۔ اُس نے دوسری جگہ شادی کرنے کی بات سلیم سے کہی۔ کئی گھرانوں کے رشتے بھی آئے، مگر وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹالتا رہا۔

اِس درمیان سلیم کو سرکاری نوکری کا آفر آیا۔ وہ ذہنی طور پر تیار نہیں تھا، لیکن ماں کے اصرار پر جوائن کر لیا۔ آفس کے کام میں لگے رہنے کی وجہ سے وقت کٹنا کافی سہل ہو گیا۔ اِس سب کے باوجود وہ نازش کی یاد کو اپنے دِل سے نہیں نکال پایا۔

گزشتہ کئی دنوں سے آفس میں کام کرنے والی سعدیہ سلیم کے چہرے پر نمایاں دُکھ کی سطریں پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سلیم کو اِس کا اندازہ نہیں تھا۔ ایک دِن کام کرتے کرتے سلیم کو چھت کی طرف تاکتے دیکھ کر سعدیہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔ دفتر کے اِس سینئر ساتھی کے لئے اُس کے دِل میں ہمدردی پیدا ہو گئی۔ اُس نے دِل ہی دِل میں سلیم کا درد جاننے کا پختہ ارادا کر لیا۔

ایک دِن لنچ کے وقت سلیم کو تنہا اور مایوس دیکھ کر سعدیہ اُس کے قریب پہنچی اور بے جھجک پوچھ بیٹھی، ?May I sit beside you، میرے کہنے کا مطلب ہے، کیا میں آپ کے ساتھ بیٹھ سکتی ہوں؟'

'شوق سے، تشریف رکھئے۔ بتائے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟' سلیم نے جواب میں کہا۔

سعدیہ بیٹھ گئی۔ اِدھر اُدھر کی رسمی باتوں کے بعد سعدیہ نے بہت پیارے انداز میں سلیم کو کُریدنا شروع کر دیا۔ کچھ نہ نہیں کے بعد سلیم نے خود کو رفتہ رفتہ

نارمل محسوس کیا۔ سعدیہ کے اصرار پر سلیم نے اپنی خاموشی توڑ دی۔ سلیم کو ایک اچھے انسان، بے لوث ہمدرد اور سچے دوست کی از حد ضرورت تھی۔ اُسے سعدیہ میں ایسا ہی کچھ نظر آیا۔ وہ سعدیہ سے اپنے ماضی کو چھپا نہیں سکا۔ کسی کتاب کی طرح سلیم نے پیار کی سوغات میں ملے درد کی حقیقت ورق در ورق سعدیہ کے سامنے کھول کر رکھ دی۔

لنچ کی میز پر ہوئی پہلی ملاقات کے بعد سلیم اور سعدیہ میں سلام و پیام اور بات چیت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رفتہ رفتہ ملاقاتیں بڑھنے لگیں۔ سلیم بھی خود کو نازش کی قید سے آزاد محسوس کرنے لگا۔ دو دِلوں کے نئے پیار کو پَر لگ گئے۔ اونچی اُڑان کے بعد آخر کار وہ دِن بھی آ گیا، جب دو دِلوں کی دھڑکنیں ایک ہو گئیں۔

سلیم اور سعدیہ نے ساتھ جینے مرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے شادی کر لی۔ بے حد سادگی کے ساتھ ہونے والی اِس شادی میں نزدیکی رشتہ داروں کے علاوہ اِسٹاف کے بھی کئی لوگ شریک ہوئے تھے۔ ازدواجی زندگی کی نئی شروعات شاندار رہی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہنسی خوشی دَس سال گذر گئے۔ اِس بیچ اُن کی ہری بھری خوبصورت بغیہ میں شارق اور شگفتہ نام کے دو پھول کھل گئے۔

وقت گزرتا رہا۔ نازش کی عمر ڈھلنے لگی۔ شروع میں کئی رِشتے آئے، لیکن دولت کے گھمنڈ میں چور عاطف نے اُن کی قدر نہیں کی۔ بعد میں رِشتے آنے بند ہو گئے۔ عاطف کی عجیب خصلت کو دیکھتے ہوئے کوئی اُس سے تعلق جوڑنا تو دُور شناسائی رکھنے تک کو تیار نہیں تھا، لیکن عاطف کو اِس کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی۔

اَب عاطف کے پاس دِن رات بیٹھک میں بیٹھ کر حقہ گرگڑانے اور چاپلوس قسم کے ناکارہ دوستوں کے ساتھ چوسر کھیلنے کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں تھا۔ اُس نے فیکٹری میں جانا قریب قریب بند کر رکھا تھا۔

تہذیب رات دن اپنی اکلوتی بیٹی کی جلدی شادی کرنے کی فکر میں گھلی جا رہی تھی۔ وہ اِس ضمن میں عاطف سے کہہ کہہ کر تھک گئی تھی، لیکن عاطف سُنی اَن سُنی کر

خاموش ہی رہتے تھے۔ اگر کبھی کُچھ بولنے کی نوبت آتی، تو بس اِتنی......

'کیا آپ ہماری حیثیت اور وقار سے واقف نہیں ہیں؟ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہمارے خاندان میں لڑکی والے رِشتہ تلاش کرنے نہیں جاتے! لڑکے والے خود رِشتہ لے کر ہمارے دروازے پر آتے ہیں۔ رِشتہ کے لئے کسی کی چوکھٹ پر جا کر ناک رگڑنا ہماری شان اور خاندانی روایت کے خلاف ہے۔' عاطف نے بیوی تہذیب پر اپنے اُونچے گھرانے کا رعب ڈالنے کے لئے بہت کچھ کہہ ڈالا۔

'دیکھئے اسلام ایثار اور برابری کا دَرس دیتا ہے۔ اللہ کے نزدیک سب انسان برابر ہیں۔ مذہب کی رُو سے کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہے۔ ہمارے نبی نے بھی کبھی انسانوں میں فرق نہیں کیا۔ محمود بادشاہ اپنے غلام ایاز کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑے ہوکر نماز ادا کرتے تھے۔ قرآن اور احادیث کی کسی کتاب میں نہیں لکھا کہ بیٹی والے رِشتہ ڈھونڈنے نہیں جائیں گے یا جوڑا تلاش کرنے کا ذمہ صرف لڑکے والوں کا ہے۔ یہ ذمہ داری تو لڑکی اور لڑکے دونوں کے گھر والوں پر برابر عائد ہوتی ہے۔' تہذیب نے عاطف کو سمجھانے کی کوشش کی۔

کیا آپ بھول گئے کہ ہمارے نبی نے اپنی لاڈلی بیٹی فاطمہ زہرہ کا رِشتہ حضرت علی کے ساتھ خود طے کیا تھا؟ کم سے کم اپنی بیٹی کی عمر کا تو خیال کرو۔ سَر کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی ہے۔ اپنی مونچھیں اُونچی رکھنے کے زعم میں اپنی بیٹی کے ارمانوں کا خون مت کیجئے۔ اُسے بھی ازدواجی زندگی جینے کا حق دے دیجئے۔ کوئی اچھا سا لڑکا تلاش کرکے اس کا نکاح کر دیجئے۔

ہو جائے گا! ہو جائے گا!! خدا کی بندی!!! نازش صرف تمہاری ہی بیٹی نہیں میری بھی ہے۔ مجھے بھی اِس کا خیال ہے۔ نازش کا رِشتہ ضرور ہو جائے گا!!! بڑی دھوم دھام کے ساتھ ہم اپنی بیٹی کی شادی کریں گے۔ تھوڑا صبر اور کیجئے۔ عاطف نے ٹالنے والا پُرانا راگ پھر اَلاپا۔

'اَب صبر نہیں ہوتا۔ بیٹی کے ارمان پانی ہو گئے ہیں۔ میں عورت ہوں۔ عورت

کا درد جانتی ہوں۔ جب نازش کے رِشتے آئے، تب آپ نے پرواہ نہیں کی۔ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی کمی نکال کر اُنہیں رَد کر دیا۔ آپ کے ساتھ چوسر کھیلنے والے دوست اور قریبی رِشتہ دار اِس طرف سے آنکھیں موندیں بیٹھے ہیں۔ تہذیب نے دوپٹے کے کونے سے آنسوں پونچھتے ہوئے کہا۔

کئی دوست واحباب سے کہہ رکھا ہے۔ جلدی ہی کوئی راستہ نکل آئے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ خُدا ہماری مدد ضرور کرے گا۔ عاطف نے تہذیب کو دِلاسہ دلایا۔

خُدا بھی اُنہیں کی مدد کرتا ہے، جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ کسی کے دروازے پر جانے میں آسمان نہیں ٹوٹ جائے گا۔ آپ کی شان کو بٹہ نہیں لگے گا۔ اپنے چچازاد بھائی عنایت والا کام مت کیجئے۔ جھوٹی شان کے زعم میں اُس کی تینوں بیٹیاں گھر بیٹھے عمر رسیدہ ہو گئیں۔ خاندانی وقار کے غرور میں وہ بھی کسی کے گھر اپنی بیٹیوں کا رِشتہ لے کر نہیں گئے۔ جو رِشتے آئے، اُنہیں ٹھکرادیا۔ اُن کے بیٹے کو بھی کورٹ میرج پر مجبور ہونا پڑا۔ میں کہتی ہوں، ابھی وقت ہے جلدی کیجئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بہت دیر ہو جائے۔ تہذیب نے ہمت جمع کر اپنی دِل کی بھڑاس شوہر پر نکال دی۔

عاطف خاموش اور گُم صُم تھے۔ اُنہیں چُپ دیکھ کر تہذیب نے پھر کہنا شروع کر دِیا۔

سلیم کی والدہ نے خود آپ کی چوکھٹ پر آکر نازش کا رِشتہ سلیم کے لئے مانگا تھا۔ نازش اور سلیم تو ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ وہ شادی کر ہنسی خوشی زندگی گزارنا چاہتے تھے، لیکن آپ نے اتنے اچھے رِشتہ میں بھی کمی نکال کر دو پیار کرنے والوں کو جُدا کر دیا۔ آپ نے نسیمہ کے دامن پھیلانے کی بھی لاج نہیں رکھی۔ نہ جانے کیا کیا کہہ کر اُسے بے عزت کیا گیا۔

یہ سن کر عاطف نے ناک بھوں چڑھائیں، مگر خاموش رہے۔

تہذیب جانتی تھی کہ خاندانی ناک کا وجود اور مونچھوں کا وقار برقرار رکھنے کے

گھمنڈ میں عاطف اپنے فرض کو پورا کرنے سے قاصر رہا ہے۔وہ نازش کی بدحال زندگی کو لے کر گُھٹ کر رہ گئی۔

نازش کے حالات سلیم سے چھپے نہیں تھے۔اُسے نازش کے ساتھ اپنی شادی نہیں ہونے کا درد تو تھا ہی،وہ نازش کے اب تک تنہا زندگی گزارنے کو لے کر بھی کافی پریشانی محسوس کرتا تھا۔لیکن اِس کے لئے نازش کے باپ کا اَڑیل رویّہ ہی ذمّہ دار ہے۔وہ چاہتے ہوئے بھی نازش کی مدد کرنے کی حالت میں نہیں تھا۔

سماج پر فرسودہ روایتوں کی دبیز چادر ڈال کر لوگوں کو گُمراہ کرنے والے اُونچی ناک کے مطلب پرست ٹھیکیداروں کے بنائے رواجوں کی بدولت آج بھی کتنی ہی معصوم لڑکیاں اپنی ازدواجی زندگی میں داخل نہیں ہوسکی ہیں۔اپنے مفاد کے لئے رائج کئے گئے سماجی دستور مانو رواج نہ ہوئے قانون ہو گئے،جنہیں بدلتے زمانے کے ساتھ بھی بدلا نہیں جا سکتا۔ اولاد کے رِشتہ کے لئے دوسرے کی چوکھٹ پر جانا کسرِ شان سمجھنے والے دقیانوسی حضرات یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ان کی ناک اور مونچھوں کی لڑائی میں کتنی ہی بے گناہ معصوم لڑکیاں رِشتے نہیں آنے کی وجہ سے گھر کی چار دیواری میں بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہورہی ہیں۔آخر کیا قصور ہے اُن کا؟لڑکی ہونا؟ یا پھر کسی دولت منداوراُونچی ناک والے گھمنڈی شخص کے گھر میں جنم لینا؟

اپنے خیالوں میں ڈوبے سلیم کو سماج کے بنائے بے مطلب کے رواجوں کے بارے میں سوچ کر متلی سی آنے لگی۔اُس نے اپنے ہاتھ میں تھامی ڈرائنگ کاپی میں سے شادی کارڈ بنا ہوا ورق پھاڑا اور ایک ہی جھٹکے میں اُس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔سلیم کو محسوس ہوا،گویا اُس نے کبھی اسکول میں تعلیم کے دوران اپنی اور نازش کے نام سے بنائے شادی کارڈ کے ملفوف کے نمونہ کے نہیں،بلکہ سماج کے بنائے دقیانوسی اور غیر ضروری رِسم و رواج کے ٹکڑے کر دِئے ہوں۔

چھٹی پوری ہونے کے بعد سلیم بیوی بچّوں کے ساتھ لکھنؤ لوٹ آیا۔لیکن وہ جب بھی کبھی اِس بارے میں سوچتا،اُسے لڑکیوں کے لئے رِشتہ لے کر نہ جانے اور پیار کرنے والے دو دِلوں کو توڑ دینے والے بے رحم سماج کے ناقص رویّہ، مبہم خیالات اور بے معنی فرسودہ رواجوں کو قائم رکھنے والے خود پسند لوگوں پر بے حد افسوس ہوتا۔ اُسے رہ رہ کر ایک ہی سوال ڈستا رہتا۔آخر اِن رواجوں کی زہریلی بیڑیوں کو کٹنے میں کتنی عمر رسیدہ دوشیزاؤں کو اپنے ارمانوں کی قربانی دینی ہوگی؟ ماحول کو سازگار اور خوشنما ہونے میں ابھی کتنا وقت اور لگے گا؟ کہنا مشکل ہے۔

○○
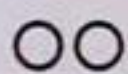
(مئی ۲۰۱۵ء)

بازگشت

رٹائرڈ فوجی دیوان سنگھ کا گاؤں صوبائی شاہراہ سے قریب ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ گاؤں تک جانے وآنے کے لئے مستقل سواری کا انتظام نہیں تھا۔ بس سے اُترنے کے بعد سڑک سے گاؤں تک پیدل ہی جانا پڑتا تھا۔ اگر کبھی کوئی شخص نجی طور پر گھوڑا تانگہ لے کر وہاں سے گذرتا یا کوئی کسان شہر میں غلّہ وغیرہ فروخت کرنے کے بعد بیل گاڑی سے لوٹتا ہوتا، تو پیدل چلنے والے شخص کو تھوڑی راحت مل جاتی تھی۔

صوبائی دارالخلافہ کے دفتر میں اپنی پنشن سے متعلق ضروری کام نپٹا کر گھر لوٹ رہے دیوان سنگھ کا گاؤں نزدیک آچکا تھا۔ اُس نے مسافروں کے چڑھنے اُترنے والی اگلی کھڑکی کے پاس سیٹ پر بیٹھے کنڈیکٹر سے بس رُکوانے کو کہا۔ کنڈیکٹر نے سر ہلاتے ہوئے سرکاری بیگ سے سیٹی نکالی اور اُسے اپنے ہونٹوں کے درمیان رکھتے ہوئے چھوٹے سے وقفہ کے ساتھ دو بار بجایا۔ بس روکنے کے لئے ڈبل سیٹی بجانے کا مطلب ڈرائیور بخوبی جانتا تھا۔ اُس نے کنڈیکٹر کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے سڑک کی بائیں جانب بس کو روک دیا۔ بس رُکتے ہی دیوان سنگھ سیٹ سے اُٹھا، سر کے اُوپر سامان رکھنے کے لئے بنی ریک پر رکھے اپنے سوٹ کیس کو اُٹھایا اور بس سے نیچے اُتر گیا۔ مسافر کے اُترتے ہی کنڈکٹر نے سنگل سیٹی بجائی۔ سیٹی بجتے ہی بس دُھواں نکالتی اور دھول اُڑاتی ہوئی آگے کی سمت روانہ ہوگئی۔

دیوان سنگھ نے سوٹ کیس سڑک کے کنارے رکھا۔ دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا کر بدن کو سیدھا کیا، پھر ہاتھوں سے کپڑوں پر لگی دُھول کو جھاڑا۔ اس کے بعد جیب سے رومال نکال کر اپنے چہرے سے گرد کے ذرّات صاف کیے۔ سڑک پر آگے اور پیچھے کی جانب دُور تک نگاہ ڈالی، لیکن کسی بھی طرف سے گاؤں کو جانے والی بیل گاڑی یا گھوڑا تانگہ آتا نظر نہیں آیا۔ گاؤں کی سمت بھی دُور تک کوئی سواری جاتی دِکھائی نہیں دی۔ دیوان سنگھ نے داہنے ہاتھ میں سوٹ کیس اُٹھایا اور گاؤں کی طرف پیدل چلنا شروع کر دیا۔

وہ گاؤں کی بدحالی اور عوام کو ملنے والی واجب سہولتوں کے نہیں ہونے سے اکثر فکر مند تو رہتا ہی تھا، اسے سڑک سے گاؤں تک آنے اور جانے کے لئے پختہ راستہ اور سواری کا نظم نہ ہونے کا قلق بھی تھا۔ گاؤں والے ہر پانچ سال کے بعد ہونے والے انتخاب کے موقعہ پر حلقۂ اسمبلی سے ایم ایل اے کا الیکشن لڑنے والے اُمید واروں سے پکی سڑک بنوانے کی گذارش کرتے۔ اُمید وار گاؤں کے افراد کو کولتار کی پکّی سڑک بنوانے کی یقین دہانی کراتے لیکن بدقسمتی یہ رہتی کہ چناؤ میں فتح یاب ہونے کے بعد کوئی بھی اسمبلی ممبر گاؤں کا رُخ نہیں کرتا۔ اِس بابت حلقہ کے ایم پی صاحب کو بھی عرضیاں دی گئیں، لیکن کسان و مزدوروں کی گذارش اور عرضیاں لبھاؤنے وعدوں کے ڈھیر کے نیچے دَب کر دَم توڑ دیتیں۔ دیوان سنگھ انہیں خیالات میں غرق تھا کہ گاؤں آ گیا۔ شام کے دھندلکے میں وہ ابھی آبادی کے نزدیک پہنچا ہی تھا کہ کسی شخص کے رونے کی آواز نے اُس کے تخیلات کو منتشر کر دیا۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ رونے کی مردانہ آواز چمنڈا دیوی کے چبوترے کی طرف سے آ رہی ہے۔ چمنڈا دیوی استھل گاؤں کے باہری کنارے پر واقع تھا۔

''کون ہے؟ کون رو رہا ہے؟ کیا بات ہو گئی بھائی؟'' دیوان سنگھ نے چمنڈا دیوی کی جانب رُخ کرتے ہوئے زوردار آواز میں پوچھا۔

دیوان سنگھ کے ٹوکنے پر رونے کی آواز اور تیز ہو گئی۔ قریب جا کر دیکھا تو

رونے والا شخص گاؤں کا ہی موہن سنگھ نکلا۔ دیوان سنگھ نے اُسے خاموش کرتے ہوئے رونے کا سبب پوچھا؟ موہن سنگھ نے دیوان سنگھ کی طرف دیکھا اور پھر زاروقطار رونا شروع کر دیا۔ دیوان سنگھ کے اصرار پر موہن سنگھ نے کہا، ''بھیّا! آج امن سنگھ نے اُس کی بہت بے عزّتی کی اور دھکّے مکّے مار کر گھر سے باہر نکال دیا۔'' اتنا کہہ کر موہن سنگھ پھر پھپھک پڑا۔

''امن سنگھ! تمہارا بیٹا!! وہ ایسا نہیں کر سکتا!!!'' دیوان سنگھ کے منہ سے نکلے الفاظ اُس کے گلے میں ہی پھنس کر رہ گئے۔ اُسے بے حد لاڈ پیار سے پال پوس کر بڑا کئے گئے اکلوتے بیٹے کے ذریعہ باپ کے ساتھ کئے گئے بے رحمانہ سلوک اور قابلِ نفرت عمل پر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ غصہ میں آگ بگولا ہو گیا۔ دیوان سنگھ کے فوجی قلب میں موہن سنگھ کے تئیں ہمدردی اور امن سنگھ کے لئے زبردست غصہ بھڑک اُٹھا۔ اُس نے موہن سنگھ کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ موہن سنگھ گھر جا کر مزید بے عزّتی کرانے کے لئے راضی نہیں تھا، لیکن دیوان سنگھ کے سمجھانے بجھانے پر تیار ہو گیا۔

گھر کے باہر فوجی دیوان سنگھ کے ساتھ موہن سنگھ کو اِس حالت میں دیکھ کر محلّہ کے کافی لوگ جمع ہو گئے۔ جس کسی نے بھی امن سنگھ کی حرکت کو سُنا، غصہ میں بھر گیا۔ امن سنگھ کو گھر کے باہر طلب کرتے ہوئے محلّہ والوں نے خوب کھری کھوٹی سنائی۔ کئی نوجوان آپے سے باہر ہوتے نظر آئے۔ اُنہوں نے امن سنگھ کی جم کر پٹائی کرنے پر زور دیا، تو کچھ لوگوں نے بیٹے کے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کرانے کی بات کہی۔ گاؤں والوں کی نگاہوں میں امن سنگھ کا جرم معافی کے قابل نہیں تھا۔ امن سنگھ کسی سے نظریں ملانے کی جرأت نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ لگاتار زمین کی طرف نگاہ گڑائے تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُسے واقعی اپنی غلطی کا شدّت سے احساس ہو گیا ہے اور وہ فرطِ ندامت سے زمین میں دھنسا جا رہا ہو۔ اُس نے لوگوں کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے مستقبل میں کبھی ایسا برتاؤ نہیں کرنے کا یقین دلاتے ہوئے معافی مانگی۔

معاملہ رفع دفع ہونے کے بعد دیوان سنگھ نے گھر میں قدم رکھا۔ کپڑے

بدلے، کھانے وغیرہ سے فراغت پائی اور آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پلنگ کے تکیہ سے کمر لگا کر بستر پر دراز ہوتے ہی اس کے سامنے موہن سنگھ کا روتا بلکتا چہرہ گھوم گیا۔ بیڈ کے سامنے دیوار پر مسکراتے بچّے کی خوبصورت تصویر آویزاں تھی۔ یہ بچّہ کوئی اور نہیں، بلکہ دیوان سنگھ کا اپنا بیٹا آنند کمار تھا۔ تین سال کی کم عمر میں دماغی بخار کے سبب موت کے سخت جان پنجوں نے اُسے اپنے آغوش میں لے لیا تھا۔ آج وہ زندہ ہوتا تو کم وبیش امن سنگھ کے ہم عمر ہی ہوتا۔ کیا باپ کے تئیں آنند کمار کا برتاؤ بھی امن سنگھ کی طرح ہی سخت اور بے حرمت والا ہوتا؟ یہ خیال آتے ہی فوجی دیوان سنگھ کے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ ہوسکتا تھا وہ بھی بے اَدب، سخت دِل اور ماں باپ کا نافرمان ہوتا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ ایسا نہ ہوکر انتہائی شریف، بااخلاق اور ہمہ وقت ماں باپ کی فرمانبرداری کرنے والا نیک انسان ہوتا!

موہن سنگھ کے ساتھ کئے گئے برتاؤ سے دیوان سنگھ غمگین اور گم صم تھا۔ باپ اور بیٹے کے بیچ تنازع کی وجہ کچھ بھی رہی ہو، لیکن باپ کے پاک اور باوقار رشتہ کو تار تار کرنے کی اجازت بیٹے کو قطعی نہیں دی جاسکتی۔ انسانی اقدار کو پامال کرنے والے بیٹے کا اس طرح کا رُوپ دیکھ کر کوئی بھی شخص یہ کہنے پر مجبور ہو جائے گا کہ ایسی نالائق اولاد سے تو بہتر ہے کہ انسان بغیر اولاد کے ہی زندگی گذار دے۔ اولاد کا سُکھ پانے کے لئے انسان کیا کیا جتن نہیں کرتا؟ موہن سنگھ نے بھی وہ سب کچھ کیا، جو وہ کر سکتا تھا۔ کاش! موہن سنگھ نے اس طرح کے جتن نہ کئے ہوتے۔ کم سے کم اس پیرانہ سالی میں ذلیل اور رسوا ہونے سے تو محفوظ رہتا۔

پانچ برس تک اولاد کا سکون حاصل نہیں ہونے کے سبب موہن سنگھ کافی پریشان رہنے لگا تھا۔ گھر میں ہی میاں بیوی کو شک کی نظر سے دیکھا جانے لگا تھا۔ مظلوم عورت کو بانجھ تک بتانے سے گریز نہیں کیا گیا تھا۔ کوئی کوئی تو دَبی زبان سے مردانہ کھوٹ نکال کر اُسے ہی خاندانی سلسلہ کو آگے بڑھانے میں روکاوٹ کا ذمہ دار گردانتا تھا۔ غرض جتنے منہ، اُتنی ہی باتیں!! بظاہر موہن سنگھ کی ازدواجی زندگی میں ہر قسم

کا آرام تھا۔ کمی تھی تو بس اتنی کہ اُس کا آنگن اولاد کی کلکاریوں سے محروم تھا۔ اولاد کا سُکھ پانے کے لئے ہر قسم کا ہتھکنڈا اپنایا گیا۔ نیم حکیموں کے نسخے اور جھولا چھاپ ڈاکٹروں کی دوا کے بے اثر رہنے کے بعد میاں جی اور فقیروں کے تعویذوں کا استعمال کرایا گیا۔ عام پنڈتوں کے علاوہ کئی نامی گرامی اوجھاؤں کے گنڈے بھی باندھے گئے۔ مرد وزن نے ساتھ ساتھ مزاروں پر حاضری دی اور عقیدت کی چادریں چڑھاتے ہوئے اولاد کی دُعائیں مانگیں۔ کئی مٹھ، آشرم اور مندروں میں پہنچ کر شیش نوایا اور منّت مانگی۔ غرض گاؤں و آس پاس کے گھاگھ قسم کے لوگوں کے دقیانوسی تجربات کی روشنی میں جس کسی نے جو بھی بتایا، بغیر کسی تامّل کے اُس پر عمل کیا گیا۔

آخر کار اُن کی دوڑ دھوپ رنگ لائی۔ قدرت نے اپنا کرشمہ دکھایا اور موہن سنگھ کی گھر والی اُمید سے ہوگئی۔ موہن سنگھ کی خوشیوں کا جہاں ٹھکانا نہیں تھا، وہیں اہل خانہ کی نظروں میں اَب دونوں مقرب ہو گئے تھے۔ پھر ایک دِن گھر میں بچّے کے رونے کی آواز سُنائی دی۔ اُنہیں تو بیٹی بھی منظور تھی، لیکن قدرت نے اُن کے دامن میں چاند کا ٹکڑا ڈال دیا تھا۔ بیٹے کی آمد نے گھر کی خوشیاں دو چند کر دی تھیں۔ نام کرن سنسکار کے موقعہ پر محلّہ والوں کو دعوت دی گئی۔ گھر میں روز روز کی لفظی تکرار ختم ہوگئی۔ شانتی کے نقیب کے طور پر بچّہ کا نام امن رکھا گیا۔ اُسی امن سنگھ نے آج انسانیت کی تمام حدیں پار کرتے ہوئے اپنے باپ کے ساتھ ایسا ناروا اور غیر مہذّب سلوک کیا، جسے کسی بھی صورت میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔

بظاہر معاملہ ختم ہو چکا تھا، لیکن دیوان سنگھ کا ذہن پانچ دہے پیچھے لوٹ گیا۔ پردۂ سیمیں پر چلتی فلم کے نظاروں کی مانند ایک ایک تصویر اس کے سامنے آتی گئی۔ موہن سنگھ کی عمر تقریباً دس برس رہی ہوگی کہ اُس کا باپ منا سنگھ کوڑھ کے موذی مرض میں مبتلا ہو گیا۔ شروع میں کمر اور سینے پر سفید رنگ کے نشان دکھائی دئے۔ جلد سے اُبھرے بڑے نشانوں میں ذکی الحس کی رمق باقی نہیں ہونے کے باوجود مرض کے بارے میں لاعلمی رہی۔ رفتہ رفتہ نسوں میں کھنچاؤ کے بعد حالت ابتر ہوتی گئی۔ مرض کی

شدّت سے چہرے کی رنگت میں تبدیلی آگئی ۔ ہاتھوں کی انگلیاں چکنی، ٹیڑھی اور سخت ہونے پر سمجھ میں آیا کہ یہ مرض جذام کا ہے۔پیروں کی انگلیاں بھی متاثر ہوگئیں۔

مرض کے دوسرے لوگوں کو لگ جانے کا خدشہ اور دہشت تھی۔کوڑھ کے مریض کو کوڑھی نام سے تو پُکارا ہی جاتا تھا، اُسے گھر میں رکھنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔گھر والوں کے اصرار اور مرض کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے بیوی نے اپنے دِل پر پتھر رکھ لیا۔ہاتھ و پیر کی گلتی انگلیوں والے مجبور شوہر کی چارپائی کمرے سے باہر نکال کر آنگن کے ایک کونے میں بنائے چھپّر کے سائے میں ڈال دی گئی ۔بستر کے ساتھ کھانے پینے کے برتن بھی الگ کردئے گئے۔ چارپائی کے قریب مٹی کا ایک چھوٹا سا گھڑا اور پیالہ رکھ دیا گیا۔منا سنگھ حقیقت سے واقف تھا۔وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ سب اس لئے کیا گیا ہے تاکہ گھر کا کوئی فرد فسادِخون کے اس مرض کی گرفت میں نہ آجائے ۔کوڑھ کا علاج آس پاس نہیں ہونے کی بنا پر اسے ایک طرح سے لاعلاج تصور کیا جاتا تھا۔

کبھی گاؤں والوں کا بے حد چہیتا منا سنگھ اَب غیروں کے ساتھ اپنوں کے لئے بھی قابلِ نفریں بن گیا تھا۔اُس کی حیثیت گھر کے کسی کونے میں پڑے بیکار اور پھٹے ہوئے جوتے کی سی ہو کر رہ گئی تھی، جسے کسی بھی وقت پیر کی ٹھوکر مار کر گھر کے باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ٹھوکر کے زبردست احساس نے اُسے اندر تک تڑپا دیا، لیکن موجودہ صورتِ حال کے مدِنظر وہ خود کو زیادہ دِنوں تک محفوظ نہیں رکھ سکا۔محلّہ والوں میں کافی تبدیلی آگئی تھی۔ گھر کے افراد بھی دامن بچانے میں عافیت سمجھنے لگے تھے۔ایک دن گاؤں کے مکھیا نے سخت الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے منا سنگھ کو گھر ہی نہیں، بلکہ گاؤں سے بھی باہر نکالنے کا حکم صادر کر دیا۔مکھیا کے حکم عدولی کی سکت کسی شخص میں نہیں تھی۔ آخر کار گھر والوں کو گاؤں کے باہر ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنا کر منا سنگھ کی کھٹیا اُس میں ڈالنی پڑی۔

جس دِن منا سنگھ کی کھاٹ گاؤں سے باہر ڈالی جا رہی تھی، اُس دن منا سنگھ

نے ہر شخص کے چہرے پر ہمدردی کے دو بول پڑھنے کی بہت کوشش کی، لیکن وہ ایسی عبارت تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ چارپائی پر تنہا پڑے منا سنگھ کو اپنی بے بسی اور لاچاری پر بہت رونا آیا۔ کچھ دیر کے بعد حواس بحال ہوئے۔ اُسے راستہ کے کنارے ایک جوتا پڑا دکھائی دیا، جو پُرانا، پھٹا ہوا اور بیکار تھا۔ جوتا دیکھ کر تنہائی کا احساس جاتا رہا۔ منا سنگھ کو لگا کہ گاؤں کے لوگوں نے بھلے ہی اُس سے منھ موڑ لیا ہو، لیکن بوسیدہ جوتا اَب بھی اُس کے دُکھ درد میں شریک ہے۔

حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ وہ جیسے تیسے گلتی انگلیوں پر کپڑے کی پٹیاں لپیٹ کر زخم چھپانے کی کوشش کرتا رہا۔ سامنے سے گذرنے والا ہر شخص اُسے پوری طرح نظرانداز کر آگے بڑھنے میں ہی عافیت سمجھتا تھا۔ لوگ یہی کہتے تھے کہ منا سنگھ نے پچھلے جنم میں ضرور کچھ ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں، جن کا خمیازہ اُسے اِس جنم میں بھوگنا پڑ رہا ہے۔

منا سنگھ پچھلے جنم میں کیا تھا؟ اس کی اُسے کوئی جانکاری نہیں تھی۔ وہ ہمہ وقت یہی سوچتا رہتا کہ کوڑھ کا مرض بھلے ہی قابلِ نفریں سہی، لیکن اسے دیا تو بھگوان نے ہی ہے۔ اس میں اُس کا کیا قصور ہے؟ دُنیا میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہے جو بیمار ہونا پسند کرتا ہو۔ پھر لوگ اُس سے اِس قدر نفرت کیوں کرنے لگے ہیں؟ فرض کیجئے اگر جذام کا یہ خبیث مرض اُن میں سے کسی شخص کو ہو جاتا، تو اُس پر کیا بیتتی اور تب اُن کا ردِ عمل کیسا ہوتا؟

مجذوم منا سنگھ کا کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا۔ مرض نے ہر شخص کو کنارہ کش ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ گھر کے افراد بھی منھ پھیرنے لگے تھے۔ بیمار شوہر کی عیادت اور ضروریات کا دھیان رکھنے والی بیوی کا جوش بھی آہستہ آہستہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ وہ صبح کے ناشتہ اور دوپہر و شام کو کھانا پہنچانے کا عمل تو پابندی سے کرتی تھی، لیکن باقی اوقات میں شوہر کی پرچھائی بھی نہیں دباتی تھی۔

مریض کی خستہ حالت دیکھ کر موہن سنگھ بھی باپ سے آنکھ چُرانے لگا تھا۔ بیمار

کی تیمارداری اوراپنے فرض سے دُور ہوتے بیٹے نے باپ کے پاس جانا قریب قریب ترک کر دیا تھا۔ نوبت یہاں تک آگئی تھی کہ باپ آواز لگاتا اور بیٹا سُننے کے باوجود سرہانہ نہیں دباتا تھا۔ اگر کبھی باپ کے پاس چلا بھی جاتا تو ناک پر کپڑا لگا کر دُور سے ہی بُلانے کا سبب دریافت کرنے کو فوقیت دیتا۔ اُسے باپ کے پاس جاتے ہوئے گھِن آتی تھی۔ ماں کبھی کھانا دِلواتی تو موہن سنگھ کھانے کی تھالی زمین پر رکھ کر اُسے لاٹھی کے سہارے باپ کی چارپائی کے نزدیک کھسکا کر چلتا بنتا۔ منّا سنگھ دِل مسوس کر رہ جاتا، پر کچھ بولتا نہیں تھا۔ وہ جیسے تیسے تھالی اُٹھا کر چارپائی پر رکھتا اور جو مِل جاتا، اُسے صبر وشکر کے ساتھ کھا پی لینے پر اکتفا کرتا۔

جذام کے مرض میں گرفتار گاؤں کے باہر چارپائی پر پڑا منّا سنگھ لوگوں کی حقارت بھری نگاہوں کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہ گاؤں والوں کی نظروں میں اور ذلیل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ مرد وخواتین کی بددُعا کے ساتھ وہ خود بھی مرنے کی تمنا کرتا، لیکن موت بھی شاید گاؤں والوں کی طرح اُس سے نفرت کرتے ہوئے دُوری بنائے ہوئے تھی۔ اُس نے کئی بار بیوی سے کھانے میں سنکھیا ملانے کی گذارش کی، مگر بیمار شوہر سے چھُٹکارا پانے کی خواہش دِل میں رکھنے والی عورت اپنے ہاتھوں اپنا سہاگ اُجاڑنے کی ہمّت نہیں جٹا سکی۔

ایک دِن موہن سنگھ پُرانا کمبل لے کر منّا سنگھ کے پاس پہنچا۔ اُس نے باپ کو علاج کا سبز باغ دکھایا اور کسی طرح اپنے ساتھ چلنے کو راضی کرتے ہوئے اُسے کمبل اُڑھا کر گاؤں کے باہر لے آیا۔ موہن سنگھ کے رویّہ میں آئی تبدیلی اور اُس کے اچانک مہربان ہونے پر منّا سنگھ متعجب تھا۔ وہ خوشی خوشی بیٹے کے ساتھ ہولیا۔ کسی طرح ایک کلومیٹر کا راستہ طے کرتے ہوئے دونوں سڑک پر پہنچے۔ تھوڑی دیر بعد بس آگئی۔ دونوں بس میں سوار ہوئے اور شہر کے لئے چل دئے۔ شہر پہنچ کر موہن سنگھ نے رِکشا کیا اور باپ کو اپنے ساتھ گنگا کے پُل پر لے گیا۔

گنگا ندی کا پُل دیکھ کر منّا سنگھ حیرت میں پڑ گیا۔ اُس نے موہن سنگھ کی طرف

دیکھتے ہوتے ہوئے پوچھا، ''تو مجھے کہاں لے آیا ہے؟ کیا اسپتال یہاں ہے بیٹا؟ تو شہر چھوڑ کر گنگا میا کے کنارے کیوں چلا آیا؟ کیا یہاں کوئی مہاتما جی ہیں جو اِس مرض کا علاج کرتے ہیں؟''

''سب کچھ سمجھ میں آجائے گا، پتا جی۔ دُنیا میں کوئی بھی جگہ ایسی نہیں ہے، جو گنگا میا کا مقابلے کر سکے۔ یہاں اسپتال نہیں ہے تو کیا ہوا؟ تمام بیماریوں سے چھٹکارا مل جاتا ہے یہاں! پاپوں سے مکتی کا استھل ہے یہ!!'' پاپ اور مکتی کی باریکیاں سمجھاتے ہوئے موہن سنگھ باپ کو بہلا پھسلا کر گنگا کے کنارے تک لے گیا۔

اُبھنتی گنگا اور پانی کے تیز بہاؤ کو دیکھ کر منا سنگھ گھبرا گیا۔ اُسے لگا کہ گنگا کا پانی اُسے آواز دے رہا ہے، لیکن وہ پانی میں ڈوب کر مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اُسے تو قدرتی موت کا انتظار تھا۔ اپنی بے بسی پر روتے ہوئے منا سنگھ نے بیٹے کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے واپس گاؤں چلنے کی فریاد کی، لیکن موہن سنگھ پر باپ کے رونے گڑگڑانے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بیٹے کے قدموں میں گر گیا۔ اُس نے زندگی کے باقی دِن گاؤں کے کنارے کاٹ لینے کی بھیک مانگی، لیکن بیٹے کا دِل نہیں پسیجا۔

موہن سنگھ کا دِل پتھر کا ہو گیا تھا۔ اُس کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ آخر میں منا سنگھ نے اُسے اُس کے حال پر گنگا کنارے چھوڑ کر چلے جانے کی بیٹے سے گذارش کی، لیکن موہن سنگھ پر حیوانیت کا ایسا بھوت سوار تھا کہ اُسے کچھ سُنائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ آخر کار اُس نے بیکس باپ کو پانی میں دھکا دے دیا اور اُلٹے پاؤں تیزی سے بھاگ کھڑا ہوا۔

موہن سنگھ بدحواسی کے عالم میں دوڑتے ہوئے پُل پر پہنچا ہی تھا کہ اپنے سامنے دیوان سنگھ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ دیوان سنگھ اپنے دوست کی میّت کی آخری رسومات ادا کرنے کی رسم میں شرکت کے لئے وہاں آیا تھا۔

موہن سنگھ اور دیوان سنگھ آمنے سامنے کھڑے تھے۔ دیوان سنگھ کی فوجی نظروں کو دال میں کچھ کالا نظر آیا۔ چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر موہن سنگھ گھبرا گیا۔ اُسے لگا کہ

اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔فوجی نے موہن سنگھ سے اُس کے وہاں آنے کا سبب پوچھا ۔موہن سنگھ نے ٹالنے کی کوشش کی، لیکن سچ چھپائے سے نہیں چھپتا! دُنیا دیکھے دیوان سنگھ کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا، ”کر آئے اپنا کام؟ دے دی مکتی؟“

موہن سنگھ کے چہرہ پر مردنی چھا گئی۔اُس نے اپنا جرم قبول کرتے ہوئے راز کو راز رکھنے کی التجا کی۔منا سنگھ کی بیوی اور گھر محلّے والے یہی سمجھتے رہے کہ مرض کی شدّت اور لوگوں کے اُلہانوں سے تنگ آ کر مُنا سنگھ گاؤں چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے۔

برسوں بیت گئے۔ امن سنگھ نے باپ کو لوری میں لے کر گھر و زمین اپنے نام کرالی۔ اچانک امن سنگھ اور موہن سنگھ میں پھر تکرار ہوگئی۔ بہو نے دوپہر کے کھانے میں سسر کو باسی روٹی پروس دی تھی۔ یہ بات موہن سنگھ کو پسند نہیں آئی۔اُس نے احتجاج کیا۔امن سنگھ نے معاملہ نبٹانے کی بجائے اپنی بیوی کی حمایت کی۔ بات بڑھ گئی۔ امن سنگھ نے باپ کے ساتھ ناروا سلوک کیا۔گالی گلوچ ہی نہیں کی، بلکہ یہ کہتے ہوئے کہ اِس گھر میں اُس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، باپ کو دھکّے دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔

موہن سنگھ روتے ہوئے گھر سے باہر آ گیا۔محلّہ کے لوگوں کو جب امن سنگھ کی بیہودگی کا علم ہوا، تو وہ غصّہ سے پاگل ہو گئے۔اس بار اُنہوں نے امن سنگھ کو سبق سکھانے کی ٹھان لی۔ کچھ ہمدرد لوگ روتے ہوئے موہن سنگھ کو فوجی کی بیٹھک پر لے گئے۔ موہن سنگھ نے بیٹے کے خلاف کارروائی کا من بنا لیا۔ گاؤں والے بھی ایک زبان ہو گئے، ”امن سنگھ کو اُس کے کئے کی سزا ضرور ملنی چاہئے۔“

دیوان سنگھ نے شور شرابہ کر رہے لوگوں سے کہا،” تم لوگ حقیقت سے ناآشنا ہو۔ سب اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جاؤ۔ گھر اور زمین امن سنگھ کے نام کر کے موہن سنگھ نے خود اپنے پیر پر کلہاڑی ماری ہے۔ موہن سنگھ! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ببول کا پودا لگا کر اُس پر سے آم نہیں توڑے جا سکتے۔ کسی دریا یا پہاڑ کے قریب کھڑے ہو کر منھ سے نکالی گئی زوردار آواز کی لوٹتی آواز لمحوں بعد ہی اپنے کانوں میں

سُنی جاتی ہے۔ اپنے ہاتھ میں پکڑی گیند کو دیوار پر مارو گے، تو وہ دیوار سے ٹکرا کر آپ کی ہی طرف آئے گی۔ عمل کے اِس ردِ عمل کو بازگشت کہتے ہیں۔" دیوان سنگھ اپنی بات ختم کر چکے تھے لیکن، "یہ بازگشت ہے! بازگشت!!" کے الفاظ عام ذہن کو دیر تک جھنجوڑتے رہے۔

موہن سنگھ، فوجی کی زبان سے نکلے الفاظ کے مطلب اور بازگشت کے معنی سے بخوبی واقف تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ چلا گیا۔ کہاں! کچھ پتہ نہیں!!

OO

(ستمبر ۲۰۱۶ء)

دُوکھی

بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے ایک رات اور گزر گئی۔ آنکھیں بند کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کئی بار کوشش کی جا چکی تھی، لیکن نیند کا دُور دُور تک پتہ نہیں تھا۔ کھلی آنکھوں میں جو منظر گردش کر رہا تھا، بند آنکھوں میں بھی ویسا ہی نظارہ اُس کے سامنے موجود تھا۔ پاپ! انجانے میں ہوا پاپ!! حالانکہ، ہر گناہ کی بھرپائی کافی مشکل ہوتی ہے، لیکن اِس پاپ نے اُس سے راتوں کی نیند اور دِن کا سکون چھین لیا تھا۔ سماج کی نظروں میں وہ مجرم تھا اور ہر مجرم کو اپنے جرم کی سزا ضرور ملتی ہے۔ وقت نہ تو کبھی ٹھہرتا ہے اور نہ ہی کسی کا انتظار کرتا ہے۔

مشرق کی جانب آسمان کے کنارے سپیدی نمودار ہو چکی تھی۔ پڑوسی کے مرغ کی بانگ ابھی کانوں میں نہیں پڑی تھی، لیکن قریب کی مسجد میں فجر کی اذان ہو چکی تھی۔ اذان شروع ہوتے ہی مندر میں گھنٹہ اور آرتی کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد چڑیوں کی چہچہاہٹ ہونے لگی۔ ان کی چہچہاہٹ نے صبح کے دلکش منظر کو پُر کیف بنا دیا تھا۔

کمرے کی کھلی کھڑکی سے باہر کا نظارہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اسی دوران گوریا کا ایک جوڑا کھڑکی میں آ بیٹھا۔ گوریا کی صفت یہ ہے کہ وہ چند لمحوں کے لئے بھی سکون سے نہیں بیٹھتی۔ اپنی چونچ کو اُوپر نیچے کرنے کے ساتھ اِدھر سے اُدھر پھدکتی رہتی ہے۔ یہ جوڑا بھی خاموش نہیں تھا۔ صبح سویرے اس کی چہچہاہٹ کسی عبادت سے کم

نہیں تھی۔ شاید وہ اپنے رب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ کہنا چاہتا تھا کہ رات کی سیاہی چھٹ چکی ہے۔ آرام کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ سونے کی بجائے بستر سے اُٹھنے اور دانہ دُنکا چُننے کے لئے گھونسلے سے باہر آنے کا وقت ہو گیا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے آزاد پرندوں کے کئی جوڑے کھڑکی میں پھدکنے لگے تھے۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ نہ صرف آلس چھوڑنے، بلکہ تروتازہ ہو کر کام دھندے میں لگ جانے کا سندیسہ دے رہی تھی۔ دُور پورب میں زرّیں شعاعوں کے ساتھ اُگ آیا آفتاب خاور بھی اس بات کا پُختہ ثبوت تھا کہ تاریک حکومت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اُجالے نے چار سو اپنا پرچم لہرا دیا ہے۔ آسمانی چراغ، پوری آب وتاب کے ساتھ اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔ قدرت نے دِن کو کام کر روزی روٹی کمانے کے لئے بنایا ہے، جبکہ رات کو دن بھر کی تکان اُتارنے اور آرام کے بعد اگلے روز کے لئے تروتازہ ہونے کے لئے مختص کیا ہے۔

رمیش کی سرخ اور بھاری آنکھیں اس بات کا ثبوت تھیں کہ وہ رات بھر سو نہیں پایا ہے، لیکن سورج طلوع ہونے کے بعد بستر پر پڑے رہنے کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ اُس نے چادر ایک جانب پھینکی، خود کو بستر سے الگ کیا اور روزمرہ کی ضروریات سے فراغت کے عمل میں لگ گیا۔ غسل خانہ سے باہر نکلتے ہوئے اُس نے ایک نظر دیوار گھڑی پر ڈالی۔ سات بج رہے تھے۔

رمیش نے خاص طور پر بنوایا کھادی کا کرتا پہنا، تہبند باندھا، کندھے پر تھیلا لٹکایا اور خود کو پوری طرح چادر میں لپیٹ لیا۔ اِس طرح کہ اُس کا چہرہ، ہاتھ اور پیروں کے علاوہ کچھ کھلا نہ رہنے پائے۔ اس کے بعد اُس نے برآمدے کے کونے میں کھڑی لاٹھی کو اُٹھایا اور غور سے دیکھا۔ لاٹھی کے کنارے پر دھاگے سے بندھے گائے کی دُم کے بالوں پر نظر پڑتے ہی آنکھیں چھلک آئیں۔ اُس نے چادر کے کونے سے آنسوں پونچھے۔ خود کو تسلّی دی، پیروں میں ہوائی چپل ڈالے اور تیز قدموں سے گھر سے باہر نکل آیا۔

بیوی رُکمنی سے رمیش کا دُکھ دیکھا نہیں جا رہا تھا، لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ پریاشچت کے دنوں میں بس اِتنا چاہتی تھی کہ کم سے کم اُس کا پتی نہار منھ جانے کی بجائے کچھ کھا پی کر گھر سے نکلے، لیکن سماج کے بندھن اور پاپ سے مکتی کی خاطر وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ مشقت کے چار دِن بیت چکے تھے۔ آج پانچویں روز بھی اُسے بھوکا رہ کر اپنے کام کو انجام دینا تھا۔ بعد کے دو دِن مزید سختی کے ہیں۔

رمیش پیشہ ور گدا نہیں تھا۔ اُس کے لئے گھر گھر جا کر بھیک مانگنا کافی کٹھن تھا۔ وہ پہلے دِن خود کو بڑی مشکل سے تیار کر پایا تھا۔ اگر اُسے نرک میں جانے کا خوف نہ ہوتا، تو وہ کسی بھی صورت میں گداگری کو اختیار نہیں کرتا۔ دھرم کی کسوٹی اور سماجی ٹھیکیداروں کے ذریعہ گھڑے گئے قوانین کے آگے عام شخص کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

گھر سے باہر قدم رکھتے ہی اُس کے کانوں میں دَوکھی اور ہتیارے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ دوکھی یعنی دوشی، دوشی یعنی پاپی اور پاپی یعنی دوزخی کی لعن طعن کی حقارت آمیز صداؤں نے دُور تک پیچھا کیا۔ اُس نے کئی بار گھر لوٹنے کا من بنایا، لیکن سماج کے خوف اور گناہ سے نجات پائے بغیر ایسا کرنا سہل نہیں تھا۔ نرک کے عذاب سے بچنے اور سورگ میں پرویش کے لئے یہ تو کرنا ہی تھا۔ محلّہ، بستی اور پہچان کے لوگوں کے کڑوے اور نفرت آمیز جملے سننے سے بچنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ آس پاس کے قریہ میں جانے کی بجائے دُور دراز کے کسی دیہات میں چلا جائے۔ اُس کے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ اگر وہ اپنے مذہب سے تعلق رکھنے والے گھروں پر نہ جا کر اقلیتی طبقہ سے متعلق افراد کے دروازوں تک جائے، تو اُس کا کام کافی آسان ہو سکتا ہے۔

لہٰذا اُس نے ایسا ہی کیا۔ کچھ لمبا راستہ طے کرتے ہوئے اقلیتوں کے گاؤں جا پہنچا۔ وہ جلدی ہی آبادی کے کنارے والے مکان کے دروازے پر پہنچا، لیکن کوشش کے باوجود کچھ بول نہیں پایا۔ سعیٔ مسلسل کے باوجود زبان سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ آخر اس طرح وہ کب تک کھڑا رہ سکتا تھا؟ اُس نے دوبارہ ہمّت کو مجتمع کیا

۔اچانک اس کے داہنے ہاتھ میں جنبش ہوئی۔ دروازہ پر دستک کے ساتھ اُس کی زبان سے یہ کلمات نکلے، ''بھکشا دیدو مائی! میں دَوکھی ہوں!! بھیک کے لئے آپ کے دُوار پر آیا ہوں۔ مجھے بھیک دے دو۔ مالک تمہارا بھلا کرے گا۔''

لفظ دَوکھی سن کر دس بارہ سال کا ایک لڑکا گھر کا دروازہ کھول کر باہر آیا۔وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ دَوکھی کیسا ہوتا ہے۔اُس نے دروازے کے سامنے کھڑے سوالی پر نظر ڈالی۔ صاف ستھرے کپڑوں میں بھیک مانگنے والا فقیراُن کے دروازے پر پہلی بار دیکھا گیا تھا۔سوالی کے ہاتھ میں ایک لاٹھی تھی۔لاٹھی کے کنارے پر کچھ بال بندھے تھے۔ لڑکے کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔وہ سوالی کو بغور دیکھے جا رہا تھا۔اسی بیچ اجنبی نے پھر اپنا سوال دوہرایا، ''بھکشا دیدو مائی! میں دَوکھی ہوں!! بھیک کے لئے آپ کے دُوار پر آیا ہوں۔ مجھے بھیک دے دو۔ مالک تمہارا بھلا کرے گا۔''

لڑکا اب بھی اجنبی سوالی کوغور سے دیکھ رہا تھا۔ سوالی نے اُس کے مقصد کو بھانپ لیا اور کہا، ''بھیّا! میں دَوکھی ہوں۔مجھ سے پاپ ہو گیا ہے۔ میں نے گئو ماتا کی ہتّیا کر دی ہے۔ مجھے سات دنوں تک قریہ قریہ، گھر گھر جا کر بھیک مانگنی ہے۔پھر پاپ مکتی کے لئے ہری دوار گنگا میّا کی شرن میں جانا ہے۔گنگا میں اسنان کرنے کے بعد میں پاپ سے مُکت ہو جاؤں گا۔''

''کیا کہا! شکل وصورت سے تو نہیں لگتا کہ آپ قاتل ہو سکتے ہیں۔وہ بھی گائے کے، جسے ہندو دھرم میں ماں ہونے کا درجہ حاصل ہے۔گائے کا دودھ جہاں صحت کے لئے مفید ہے، وہیں اس کے گوبر تک کو پوِتر مانا گیا ہے۔''لڑکے نے اپنے خدشہ کا اظہار کیا۔

''ہاں بھائی!میں دیکھنے میں بھلے ہی ہتّیارا نہ لگتا ہوں،لیکن حقیقت یہی ہے۔ میں کھیت پر کام کر رہا تھا۔ اِسی دوران گاؤں کے ساہوکار کی کئی گائیں گھومتی گھامتی اور چرتی چراتی وہاں آ گئیں۔اُنھوں نے گیہوں کی فصل میں منھ مارنا شروع کر دیا۔ میں نے اُنہیں ہڑکایا۔ٹس سے مس نہیں ہونے پر اُنہیں لاٹھی کے سہارے ہٹانے کی کوشش

کی ،لیکن وہ نہیں ہٹیں۔ شاید بھوکی تھیں۔ بار بار کھدیڑنے پر بھی نہیں ہٹنے کی وجہ سے مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے ہاتھ کی لاٹھی کو گائے کے سر پہ دے مارا۔ میرے وار سے بچنے کے لئے سر گھماتے ہی لاٹھی اُس کے سر پر لگی۔ لاٹھی لگتے ہی گائے چکرا کر زمین پر گر گئی اور موقعہ پر ہی دَم توڑ دیا ۔ عام طور پر کسان کے ڈنڈوں سے جانور مرا نہیں کرتے ،لیکن ہتّیا کا کلنک اُس کے سر لگنا تھا۔ بھگوان کو یہی منظور تھا۔'' سوالی اپنی کہانی دوہرانے کے درمیان ماضی کی واردات میں کھو گیا۔

سامنے گائے پڑی تھی۔ بے حس و حرکت ۔ اُس نے ہاتھ سے لاٹھی کو ایسے پھینک دیا، جیسے وہ لاٹھی نہ ہو، بلکہ خطرناک قسم کا سانپ ہو۔ غصہ میں تمتماتا ہوا ساہوکار کا چہرہ بھی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔خوف و شرمندگی بڑھتی جا رہی تھی۔ آنکھوں سے کفارے کے آنسو گرنے لگے۔اُس نے کندھے پر پڑا گمچھا اُتارا اور خشک گالوں پر لڑھکتے آنسو پونچھنے لگا،لیکن آنسو تھے کہ رُکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ وِلاپ کے آنسو آسانی سے رُکتے بھی نہیں۔ جی بھر کر رونے کے بعد ہی ٹھہرتے ہیں۔

رمیش مردہ گائے کے قریب بیٹھ گیا۔اُس کا بین جاری تھا۔ وہ خود کو گئو ماتا کی ہتّیا کا ذمہ دار سمجھ رہا تھا،لیکن دِل کے گوشہ میں یہ خیال بھی اُبھر جاتا تھا کہ یہ محض ایک حادثہ ہے۔ وہ قطعی طور پر اس کے لئے ذمہ دار نہیں ہے۔کبھی وہ خود کو بے گناہ تصور کرتا اور کبھی قاتل! کاش وہ غصہ میں آپا نہ کھوتا! کاش وہ چہرے پر وار نہ کرتا!! بدن کے دوسرے حصے پر لاٹھی لگنے سے اس کی موت تو واقع نہ ہوتی!!!

اُس کے بدن میں کہاں سے طاقت آ گئی؟ ایک ہی وار میں منھ اور ناک سے خون نکل پڑا۔گائے کے تڑپتے جسم کو دیکھ کر وہ گھبرا گیا ۔اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ پانی پلانے سے شاید جان بچ جائے،مگر پانی کی گھڑیا جھونپڑی میں تھی۔ جھونپڑی کچھ فاصلہ پر تھی۔اُس نے جھونپڑی کی جانب دَوڑ لگا دی۔ گگری پر رکھے پیالے میں پانی بھرا اور پھرتی سے لوٹ آیا،لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔ گئو ماتا نے تڑپ تڑپ کر دَم توڑ دیا تھا۔

گاؤں والوں کو خبر ہو گئی۔ ہر کوئی اُسے ہتیارا بتا رہا تھا۔ گاؤں کی پنچایت میں افلاس کا پلڑا ہلکا پڑ گیا۔ کسی پنچ میں ساہوکار سے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ اُنہوں نے اپنی گایوں کے چارے پانی کا بہتر بندوبست کرنے کی بجائے اُنہیں دوسرے کسانوں کی فصل میں منھ ڈالنے کے لئے کُھلے مہار کیوں چھوڑ رکھا تھا؟

پنچایت میں موجود پنچوں نے رمیش کو گئو ہتیا کا قصوروار مانا۔ پروہت پنڈت دین دیال نے گو ماتا کی جان لینے والے غریب کسان کو قصائی، قاتل، پاپی اور دوکھی (دوزخی) بتاتے ہوئے اُسے اِس گھور پاپ کے پریاشچت (ازالہ) کا فرمان سنایا۔ گناہ عظیم کے ازالہ کے طور پر اُسے اپنا گاؤں چھوڑ کر قرب و جوار کے دیہاتوں میں جا کر سات دِن تک سات گھروں سے بھکشا مانگنی تھی۔ فقیر کے بھیس میں گاؤں گاؤں جانے والے رمیش کو ہر دروازے پر یہ بھی واضح کرنا تھا کہ وہ ایک دَوکھی ہے۔ اُس کے سر گئوماتا کی ہتیا کا گھور پاپ ہے۔ بھیک میں حاصل ہونے والے روپے، اناج یا آٹے کو جمع کر ہری دوار میں دان کرنے کے بعد گنگا جی میں اسنان کرنا ہے۔ اس کے بعد وہ پاپ مکت ہو جائے گا۔ گھر واپسی پر اُسے بھنڈارا کر بستی والوں کو کھانا بھی کھلانا ہے۔

رمیش پنڈت دین دیال کے ذریعہ طے کی گئی سزا اور ماضی کے گرداب سے تب باہر نکلا، جب لڑکے نے گھر سے تھیلا بھر آٹا لا کر اس کی جانب بڑھا دیا۔ اُس نے لڑکے کی طرف مشکور نگاہوں سے دیکھا اور دُعا دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ پہلے دِن اُس نے ایک گاؤں کے سات گھروں پر دستک دے کر بھیک حاصل کی تھی۔ آخر کار رمیش نے ایک ایک کر سات دِنوں کی سزا مکمل کر لی۔ مانگ کر حاصل کی گئی رقم اور دیگر اشیاء کو ہری دوار لے جا کر دان کیا۔ گنگا میں اسنان کے ساتھ رمیش نے خود کو ذہنی طور پر ہلکا اور پاپ سے مُکت پایا۔ گھر واپسی پر رمیش نے بھنڈارے کا انعقاد کیا اور بستی والوں کو دعوت دی۔ وقت لگاتار اپنی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ رمیش بھی اپنے کام کاج میں منہمک ہو گیا۔

ساہوکار گھمنڈی لال کے یہاں کئی نوکر کام کرتے تھے۔ان میں زیادہ تر کا تعلق پوربی صوبہ سے تھا۔ غربت کے مارے یہ بے روزگار محنت مزدوری کر روزی روٹی کمانے کے لئے اِدھر آتے تھے۔علاقہ کے بڑے کسان اور تجارتی معمولی تنخواہ پر آسانی سے ملنے والے ان مزدوروں کا استحصال کرتے تھے۔خوب کام لینے کے باوجود کبھی کبھی اُنہیں تنخواہ تک نہیں دی جاتی تھی۔

رام دین، ساہوکار گھمنڈی لال کے یہاں نوکر تھا۔مزدور بیچ میں کام چھوڑ کر نہ چلے جائیں،اس لئے وہ چھ مہینے کی تنخواہ روک کر چلتا تھا۔مزدوروں کے گھر جاتے وقت بھی حساب بیباک نہیں کرتا تھا۔اُسے ڈر رہتا تھا کہ اگر اُس نے مزدوروں کو پورا پیمنٹ کر دیا،تو وہ شاید اُس کے پاس لوٹ کر نہ آئیں گے،اور زیادہ تنخواہ دینے والے کسی دوسرے کسان کے پاس چلے جائیں گے۔

رام دین کو ماں کے بیمار ہونے کی اطلاع ملی۔وہ اُسے دیکھنے کے لئے گھر جانا چاہتا تھا۔قریب ہفتہ بھر سے وہ ساہوکار سے گھر جانے کی اجازت کے ساتھ اپنی پوری اجرت مانگ رہا تھا،لیکن ساہوکار روپے دینے کی بجائے برابر ٹال رہا تھا۔رام دین کسی بھی صورت میں گھر جانا چاہتا تھا،لیکن خالی ہاتھ جانے کا کچھ فائدہ نہیں تھا۔ بیمار ماں کے علاج کے لئے کچھ روپے تو اُس کے پاس ہونے ہی چاہئے تھے،مگر ساہوکار روپے نہیں دے رہا تھا۔

ایک دن شام کو ساہوکار نے رام دین اور تُراب احمد کو آپس میں بات چیت کرتے دیکھ لیا۔اُسے لگا کہ بڑا کسان تُراب احمد، رام دین کو اپنے پاس نوکر رکھنے کے لئے اُس پر ڈورے ڈال رہا ہے۔لیکن اس بابت اُس نے رام دین سے کوئی بات نہیں کی۔

صبح کو رام دین نے اپنے کپڑے لتّے سمیٹے اور گھر جانے سے قبل ساہوکار کو پرنام کرنے چلا گیا۔ساہوکار اُسے اِس حالت میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''تو تم اپنے گھر جا رہے ہو،رام دین'' ساہوکار نے سوال کیا۔

''ہاں مالک، بیمار ماں کو دیکھ کر جلدی ہی لوٹ آؤں گا۔'' رام دین نے مختصر سا جواب دیا۔

''خالی ہاتھ جا کر کیا کروگے، رام دین۔ کرایہ کے علاوہ جیب میں بھی کچھ روپے ہونے چاہئیں۔ علاج میں بھی کچھ خرچ کرنا پڑ سکتا ہے۔'' ساہوکار نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''جی مالک! تُراب احمد جی سے دو ہزار روپے اُدھار مل گئے ہیں۔ واپسی پر آپ سے ملنے والی اُجرت میں سے اُنہیں لوٹا دونگا۔ اچھا مالک پرنام!'' یہ کہتے ہوئے رام دین چلنے لگا۔

''ٹھہرو! تم نے چوری کی ہے۔ تم میرے روپے چُرا کر نہیں جا سکتے۔ دکھاؤ کتنے روپے ہیں تمہارے پاس؟'' ساہوکار نے سوال کیا۔

یہ سن کر رام دین ہکا بکا رہ گیا۔ ''مالک میں نے کوئی چوری نہیں کی ہے۔ میرے پاس صرف وہی دو ہزار روپے ہیں، جو مجھے تُراب احمد جی نے اُدھار دئے ہیں۔'' رام دین نے صفائی دی۔

''اس معاملہ کو لے کر کل بستی میں پنچایت ہوگی۔ اُس میں دونوں اپنی اپنی بات رکھیں گے، میں بھی اور تم بھی۔ پنچ جو فیصلہ کریں گے، وہ قبول ہے۔'' ساہوکار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مالک، میری ماں بہت بیمار ہے۔ راجن کہہ رہا تھا کہ اگر وہ ایک دو دن میں گاؤں نہیں پہنچا، تو اُسے ماں کی صورت دیکھنے کو نہیں ملے گی۔ آپ سے گہار کرتے کرتے آج سات روز ہو گئے۔ مالک اس وقت مجھے جانے دیں۔ واپسی میں جو چاہے سزا دے دیں۔ بس اَب جانے دیجئے ......'' رام دین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ساہوکار پر رام دین کے رونے دھونے کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ اگلے دن سرپنچ اور پُروہت پنڈت دین دیال کی قیادت میں گاؤں کی پنچایت بیٹھی۔ ساہوکار نے رام

دین کے ذریعہ ان کی الماری سے دو ہزار روپے چوری کرنے کا الزام لگایا۔آنکھوں میں آنسو بھرے رام دین نے پنچوں کے سامنے حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا،''میری ماں بیمار ہے۔میں اُسے دیکھنے اور علاج میں تھوڑی بہت مدد کرنا چاہتا تھا،لیکن مالک نے میری چھ مہینے کی اُجرت نہیں دی۔میری مجبوری سن کر تُراب احمد جی کو ترس آگیا۔ اُنہوں نے اس شرط پر مجھے دو ہزار روپے اُدھار دئے کہ واپسی میں ساہوکار سے روپے لے کر اُنہیں لوٹا دوں ۔ یہ روپے لے کر میں گھر جا رہا تھا۔مالک نے میری تلاشی بھی لی،لیکن ان کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں نکلا۔''رام دین اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

پنچایت میں موجود تُراب احمد نے رام دین کے سچ کہنے کی گواہی دی۔اُنہوں نے انکشاف کرتے ہوئے کہا کہ اَب رام دین کے گھر جانے یا نہ جانے کچھ معنی نہیں ہیں! اُس کی ماں اَب دُنیا میں نہیں رہی ۔دو روز قبل اس کا انتقال ہو گیا ہے۔شام گھر سے لوٹے رام دین کے گاؤں کے سوہن نے یہ اطلاع دی ہے۔وہ میرے یہاں کام کرتا ہے۔

اتنا سنتے ہی پنچوں کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا رام دین بے ہوش ہو کر گر گیا۔ساتھی مزدور دَوڑ کر آئے ۔ اُسے سیدھا کیا،منہ پر پانی چھڑکا اور ہاتھ پیر سہلائے۔رمیش نے آگے بڑھ کر ناڑی ٹٹولی۔نبض کا دُور تک پتہ نہیں تھا۔رام دین مر چکا تھا۔رام دین کے دَم توڑنے کے باوجود سرپنچ یا پنچوں میں سے کسی کی آنکھوں میں آنسو نہیں آئے۔اُس کے گاؤں یا علاقے کے بے بس مزدوروں کی آنکھیں ضرور نم تھیں ۔ لاش کے پاس بیٹھے رمیش کی نظروں میں ساہوکار، رام دین کی موت کا واحد ذمہ دار تھا،لیکن اُسے دَوکھی قرار دینے والے پنڈت دین دیال یا پنچوں میں سے کسی میں بھی ساہوکار کو دَوکھی (دوشی) کہنے کی ہمت نہیں تھی۔

○○

(ستمبر ۲۰۱۷ء)

اکویریم میں قید ماہی

تیزی سے دوڑتی شہر کی ماڈرن اور حساس زندگی کے بیچ یونیورسٹی سے امتیازی حیثیت کے ساتھ پوسٹ گریجویشن کرنے والی شاہین کو گاؤں کے ماحول میں آئے چار سال کا عرصہ بیت چکا تھا، لیکن کوشش کے باوجود وہ اپنے آپ کو دیہاتی ماحول میں ڈھال نہیں پائی تھی۔ اِسے اُس کی بدقسمتی کہیئے یا پھر اہلِ خانہ کا جلد بازی میں لیا گیا فیصلہ، جس کی وجہ سے وہ ساجد کے ساتھ اپنی ازدواجی زندگی کی گاڑی گھسیٹنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

ساجد کا تعلق اُتر پردیش کے چھوٹے سے گاؤں شہزاد پور سے تھا۔ دادا، دادی اور ماں باپ کے علاوہ اُس کے ایک چھوٹا بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ گھر بہت بڑا نہیں تو بہت چھوٹا بھی نہیں تھا۔ سبھی افراد پُرانی طرز کے درمیانہ قسم کے مکان میں رہتے تھے۔ مکان، برآمدہ والے دو بڑے کمروں، ایک اسٹور اور مہمانوں کے بیٹھنے کے لئے ایک چھوٹی سی بیٹھک پر مشتمل تھا۔ باورچی خانہ کے علاوہ بیت الخلاء بھی پُرانے طرز کا تھا۔ بظاہر گھر میں کچھ نیا نہیں تھا۔ اگر کچھ نیا تھا، تو وہ اکویرِیم (Aquarium) تھا، جسے برآمدہ کے چار پہلو ستون (Pillar) میں بہت قرینہ سے لگایا گیا تھا۔ اکویرِیم میں چھوٹی اور بہت خوبصورت رنگین مچھلیاں تھیں، جو پانی میں اوپر نیچے تیراور گھوم رہی تھیں۔ یہ کبھی بہت تیزی سے پیچھے کی طرف مُڑ جاتیں اور کبھی ایک جگہ ٹھہر کر منھ سے بُلبلے نکالنے لگتیں۔

ساجد کے دادا اور دادی ایک کمرے میں رہتے تھے۔ دوسرے کمرے میں والد اور والدہ کا بسیرا تھا۔ برآمدہ کے ایک حصّہ میں دونوں بھائی اور دوسرے حصّہ میں بہنیں رہتی تھیں۔ ساجد سے شادی کے بعد شاہین کے گھر آجانے سے بس اتنی تبدیلی ہوئی کہ اَب دادا جی کا بستر بیٹھک میں پہنچا دیا گیااور دادی جی کی چارپائی کمرے سے باہر برآمدہ میں ڈال دی گئی تھی۔ خالی کیا گیا کمرہ اَب نئی نویلی دُلہن اور ساجد کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔ دادا اور دادی کو الگ کئے جانے کی بات شاہین کی سمجھ میں قطعی نہیں آ رہی تھی۔ اُس کے نزدیک دونوں کو الگ کئے جانے کا فیصلہ غلط تھا۔ اُس کی سوچ تھی کہ زندگی کے آخری پائیدان پر کھڑے یا ایک طرح سے قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے دادا اور دادی کو اس وقت ایک دوسرے کی قربت کی زیادہ ضرورت تھی۔ اُنہیں ایک ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنے دینا ہی مناسب تھا۔ اگر سسر صاحب بیٹھک میں نہیں جانا چاہتے تھے تو یہ بھی ممکن تھا کہ والد اور والدہ چھوٹے بھائی کے ساتھ برآمدے میں منتقل ہو جاتے اور کمرہ دادی اور دونوں بہنوں کے لئے چھوڑ دیا جاتا، لیکن ایسا کرنے سے بھی گریز کیا گیا۔

شاہین نے جس روز دُلہن بن کر گھر میں قدم رکھا تھا، سب نے اُس کی بلائیں لی تھیں۔ ہر کام اُس کی خواہش وخوشنودی کو مدِ نظر رکھ کر کیا جا رہا تھا۔ شادی میں آیا جہیز کمرے میں بے حد سلیقہ سے سجایا گیا تھا۔ ڈبل بیڈ و دیگر سامان سے کمرہ گھر جانے کی وجہ سے صوفہ سیٹ اور ڈائننگ ٹیبل کو برآمدے میں رکھا گیا تھا۔ شام کا کھانا نندوں نے اپنے ساتھ کھلایا۔ بھابی کو زیادہ دقّت نہ ہو، اس لئے کھانا ڈبل بیڈ پر ہی لگا دیا گیا تھا۔ کھانے میں مرغ و ماہی کے کباب و کوفتوں کے علاوہ کئی طرح کی ڈشیں موجود تھیں۔ تلے ہوئے مرغ (Fried chicken) اور بھنی ہوئی مچھلی (Roasted fish) دیکھ کر شاہین کو ایسا لگا جیسے گھر کا کھانا بھی اُس کے ساتھ سسرال آ گیا ہو۔ بہت ہی معصوم اور پیاری نندوں کے ساتھ کھانا تناول کرتے ہوئے شاہین کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ بار بار اپنی نندوں کے کھلے چہروں کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ ایسا لگ رہا

تھا، جیسے یہاں اُسے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوگی، لیکن اُس کی یہ خوشی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکی۔ ضروری حاجت کے لئے شاہین کو بیت الخلاء جانا تھا۔ ایک نند نے اُس کی رہنمائی کی۔ کمرے سے باہر آئی شاہین پُرانی طرز کا عجیب سابیت الخلاء دیکھ کرنہ صرف حیران رہ گئی، بلکہ اُس نے کافی پریشانی بھی محسوس کی۔ اُس کی حالت غیر ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ اُسے متلی آ جائے اور سب کھایا پیا نکل جائے، اُس نے کسی طرح فراغت پائی اور جلدی سے باہر نکل آنے کو غنیمت سمجھا۔ اس تجربہ نے اُسے بے چین کر دیا۔

شاہین کا تعلق متمول گھرانے سے تھا۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ نہایت ہی شاندار قسم کے فلیٹ میں عیش ونشاط کی پُر کیف زندگی گذارنے والی شاہین کو شادی کے بعد کی زندگی دیہات کے دقیانوسی اور عُسرت بھرے ماحول میں بِتانی پڑے گی۔ اپنے گھر میں رہتے جس نے کچن میں خودکار چولہے (Automatic oven) کا استعمال کیا ہو، وہیں گاؤں میں اُس کا سابقہ مٹی کے بنے چولہے اور اُس میں استعمال ہونے والی لکڑیوں سے پڑے گا! چائے بنانے کے لئے بھی گھر کے صحن میں لگے دستی نل (Hand pump) سے پانی نکال کر لانا ہوگا!! ڈبّوں میں بھرے پسے پسائے مسالوں کے استعمال یا مکسی (Mixer grinder) کی جگہ گھر کے ایک کونے میں پڑی بے نور پتّھر کی سِل پر بٹّے سے مسالہ پیسنا ہوگا!! کھانے کی میز (Dinning table) کی بجائے فرش پر دستر خوان بچھا کر کھانا کھانا پڑے گا۔

گھر میں بے حد خوشحالی کے سبب شاہین نے اپنی ازدواجی زندگی کو لے کر جو تانا بانا بنا تھا، وہ مکڑی کے بوسیدہ جالے کی مانند ٹوٹ چکا تھا۔ دیکھے گئے خوابوں کی دُنیا کا حسین تصور چکنا چور ہو کر بکھر چکا تھا۔ وہ بے حد تناؤ اور اُلجھن میں تھی۔ اُس کے سامنے ایک لمبی زندگی پڑی تھی۔ اِس ماحول میں وہ پہاڑ جیسی زندگی کیسے کاٹ پائے گی ؟ یہی سوال اُسے بے چین کر رہا تھا۔ کاش! اُس کے ماں باپ نے اپنی بیٹی کی زندگی کا فیصلہ کرنے سے پہلے اُس کی پُر کیف پرورش کے علاوہ شہر اور دیہات کے نمایاں

فرق کا موازنہ بھی کیا ہوتا۔ یہ بھی سوچا ہوتا کہ شہر کے بے حد حسین اور ترقیاتی ماحول کی چکا چوند میں پل کر بڑی ہوئی پڑھی لکھی آزاد خیالات کی ماڈیسٹ (Modest) لڑکی، ضروری سہولتوں سے محروم اور کئی طرح کے قیدو بند میں جکڑے گاؤں کے دہقانی ماحول میں اپنے آپ کو کس طرح ڈھال پائے گی؟ وہ انہیں خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ اچانک اُس کی نگاہ اکوریم پر پڑی، جس میں رنگ برنگی خوبصورت مچھلیاں تھیں۔ اُسے اپنا وجود بھی ایک مچھلی کی طرح نظر آیا۔ فرق بس اتنا تھا کہ مچھلیاں چھوٹے سے اکوریم میں قید تھیں اور وہ بڑے اکوریم میں بند! اُسے معصوم مچھلیوں پر ترس آیا۔ اُس نے دِل ہی دِل میں اُنہیں آزاد کرانے کا ارادہ کر لیا۔ وہ خود بھی آزاد ہونے کا خواب دیکھنے لگی۔

شاہین کو سب سے زیادہ حیرانی اپنے والد کے فیصلہ پر تھی۔ اُس کے ذہن میں رہ رہ کر یہی سوال گردش کر رہا تھا کہ اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے قبل اُس کی رائے تک کیوں نہیں لی گئی؟ اُنہیں صرف ساجد کی خوبصورتی، تعلیم اور دفتر کی معمولی نوکری ہی نظر آئی۔ اپنی بیٹی کی زندگی کے بارے میں قطعی نہیں سوچا۔ اُنہیں اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ دیکھنا چاہئے تھا۔

شاہین کے والد نوید اختر شہر کے بڑے بلڈر اور مالدار اشخاص میں سے ایک تھے۔ ایک دن وہ اپنے دفتر میں بیٹھے کچھ ضروری کاغذات دیکھ رہے تھے۔ تبھی ایک نوجوان نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر سلام کیا اور اندر آنے کی اجازت مانگی۔ اجازت ملنے پر وہ اندر آ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔ ہاتھ کا کام ختم کرنے کے بعد نوید اختر نے نوجوان کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھا۔

نوجوان نے بیگ ٹیبل پر رکھ کر اُسے آگے بڑھاتے ہوئے کہا، ”سر! یہ بیگ مجھے راستہ میں پڑا ملا۔ اس کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ میں نے بیگ اُٹھا لیا۔ اِس پر آپ کے نام و پتہ کی چٹ لگی تھی۔ چٹ کو غور سے پڑھا اور بیگ کو دونوں ہاتھوں سے دبا کر دیکھا۔ بیگ میں نوٹوں کی گڈیاں جیسا کچھ محسوس ہوا۔ انگلیوں سے دوبارہ

دبا کر دیکھنے سے میرا شک یقین میں بدل گیا۔تھوڑی سی زِپ کھول کر تسلی کی۔ بیگ میں واقعی نوٹ بھرے تھے۔ پہلے میرے ذہن میں آیا کہ بیگ پولیس کے حوالے کر دوں اور اپنے راستے چلا جاؤں۔ پھر بیگ پر آپ کا نام اور دفتر کا مکمل پتہ درج پا کر میرا ارادہ بدل گیا۔ میں نے بیگ سیدھے آپ تک پہنچانے کا فیصلہ کیا۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے میری مدد کی اور میں تلاش کرتا ہوا یہاں تک آ گیا۔ آپ کی امانت آپ تک پہنچانے کے لئے میں اللہ کا شکر گزار ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ نوجوان سلام کر واپس جانے لگا۔

''ٹھہرے! اس بیگ میں روپے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے، پَر کتنے ہیں، یہ بھی جانتے ہو؟ شاید نہیں!! بیس لاکھ روپے ہیں بیگ میں!!! دیکھو۔'' یہ کہتے ہوئے نوید اختر نے بیگ کی زِپ کھول کر روپیوں کی گڈیاں میز پر اُلٹ دیں۔

''سر! مجھے اس کا علم نہیں کہ بیگ میں کتنے روپے ہیں؟ صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ بیگ نوٹوں سے پوری طرح بھرا ہوا ہے۔ ظاہر ہے رقم بھی بہت بڑی ہوگی۔ کیا اَب جاؤں؟'' نوجوان نے اپنی بات مکمل کی۔

''چلے جانا، لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بیگ میں بڑی مقدار میں نوٹ بھرے ہیں، تم اِسے مجھ تک پہنچانے کی بجائے رقم اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گئے؟'' نوید اختر نے ایک تجسس بھری نگاہ نوجوان پر ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

''آپ کا سوال دُرست ہے، سر! میں مسلمان ہوں۔ میرا نام ساجد ہے۔ گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ میرے خاندان کے تمام افراد بہت حد تک اسلام کے اصولوں کو فوقیت دے کر اُن پر عمل کرنے میں خوشی اور سکون محسوس کرتے ہیں۔ اسلام ہمیں صرف بے ایمانی کرنے سے ہی نہیں روکتا، بلکہ راستہ میں پڑی ملنے والی چیز کو اُس کے مالک تک پہنچانے کا حکم بھی دیتا ہے۔ میں نے وہی کیا، جو اللہ کو پسند ہے اور اُس کے رسول کا بتایا ہوا طریقہ ہے۔'' اپنی بات مکمل کرتے ہوئے ساجد کے چہرے

پرسکون صاف دکھائی دے رہا تھا۔
''کیا کام کرتے ہو، برخوردار؟'' نوید اختر نے پوچھا۔
''کل تک نوکری کی تلاش میں تھا۔ اللہ کا فضل اور احسان ہے کہ اُس نے آج ہی ایک کمپنی میں تیس ہزار روپے مہینہ کی نوکری دلادی ہے۔'' ساجد نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔
''میری بہت بڑی کمپنی ہے۔ کیا تم میرے ساتھ میری کمپنی میں اپنی شرائط پر کام کرنا پسند کروگے؟ کم سے کم پچاس ہزار روپے مہینہ یا جو تم خود اپنے لئے طے کرو۔ اس کے علاوہ دیگر سہولتیں بھی حاصل رہیں گی۔'' نوید اختر نے ساجد کے سامنے بہت بڑا آفر پیش کیا۔
''سوری سر! میں نوکری قبول کر چکا ہوں۔ حالانکہ ہر مہینے ملنے والی بیس ہزار روپے کی فاضل رقم سے میرے بہت سے کام حل ہو جائیں گے، لیکن مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی کو زبان دے کر اُس سے پلٹ جائے۔ پیغمبرِ اسلام نے اِسے ناپسند کیا ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتا!!'' ساجد نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے دوٹوک کہہ دیا۔
''Weldone my boy! یہ میرا وِزِٹنگ کارڈ (Visiting card) ہے۔ اِس پر ٹیلی فون نمبر بھی درج ہیں۔ اپنا نام اور پتہ ایک کاغذ پر لکھ کر مجھے دے دو۔ تم جب چاہو مجھ سے ٹیلی فون پر بات کر سکتے ہو۔ اور ہاں، کبھی کبھی دفتر بھی آتے جاتے رہنا۔ یہ پانچ لاکھ روپئے میری طرف سے رکھ لیجئے۔ تمہاری ایمانداری کا انعام ہے۔'' نوید اختر نے کہا۔
''نہیں سر! یہ میں نہیں لے سکتا۔ روپیوں کا لالچ ہوتا، تو بیگ اپنے ساتھ لے جاتا۔ اتنی بڑی رقم سے کوئی بھی کاروبار کر لیتا۔ اِسے آپ تک ہی کیوں پہنچاتا؟ ایمانداری کا دولت سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا!! ہاں! اگر آپ مجھے کچھ دینا ہی چاہتے ہیں، تو مجھے تا حیات ثابت قدمی، نیک نیتی اور حلال طریقہ پر رزق حاصل کرنے کی دُعا

دے دیجئے۔'' اچھا چلتا ہوں۔ السلام وعلیکم!

ساجد کی ایماندارانہ گفتگو، نیک نیتی اور طرزِعمل نے نوید اختر کو اندر تک جھنجھوڑ ڈالا۔ دِل کی یہ کیفیت ہوگئی کہ ساجد کے دفتر سے چلے جانے کے باوجود وہ کافی دیر تک اُس کے خیالوں میں ڈوبا رہا۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی ساجد کے ساتھ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ شاہین، ساجد جیسے نیک کردار اور ایماندار نوجوان کے ساتھ ایک کامیاب اور خوشگوار ازدواجی زندگی گزار سکے گی۔

حالانکہ شاہین نے گھر کے کسی فرد سے کوئی شکایت نہیں کی تھی، لیکن ساجد کے علاوہ گھر کے دیگر افراد بھی اُس کے چہرے پر جب تب اُبھر آنے والی عبارت کو آسانی سے پڑھ سکتے تھے۔ ساجد، نوید اختر کی کسوٹی پر کھرا اُترنے کی سعی کے ساتھ اُن کے اعتبار کو بھی کسی طرح کی ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کی کوشش تھی کہ شاہین ہر حال میں خوش وخرم رہے۔ اس لئے شادی کے بعد پڑنے والے پہلے اتوار کی سویرے وہ شہر گیا اور کچن وگھر کے لئے ضروری سامان خرید کر لایا۔ اُس نے پہلی فرصت میں پانی بہانے والا بیت الخلاء(Flush latrine) بنوایا، تاکہ شہر کے آرام دہ ماحول میں زندگی گزارنے والی شاہین کو زیادہ دِقتوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ساجد نے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے شاہین کو یقین دِلایا کہ اُسے اُس کی تمام تر ضروریات کا علم ہے۔ وہ اس گھر کو بھی اُس کے حساب سے سنوارنے (Maintain) میں کوئی کوتاہی نہیں برتے گا۔ ہوا بھی یہی، ساجد نے رفتہ رفتہ شہری ماحول کی تمام تر سہولتوں کا ذخیرہ گھر میں جمع کر دیا۔

ساجد نے شاہین کے جہیز میں آئے گیس کے چولہے، ریگولیٹر اور سلینڈر کو پُرانے طرز کے باورچی خانہ میں لکڑی کی چھوٹی میز پر نسب کر دیا۔ واٹر کولر کو تازے پانی سے بھر کر اسٹول پر رکھا گیا۔ شہر سے خرید کر لائی گئی دالیں، نمک، مرچ، مسالے، چینی، چائے پتی وغیرہ کو پلاسٹک کے سفید خوبصورت ڈبّوں میں بھر کر اُنہیں لوہے کی

کیلوں پر رکھے لکڑی کے تختوں پر سلیقہ سے سجایا گیا۔ کچن کو لکڑی کے دھویں سے پاک وصاف رکھنے کی منشاء سے مٹی کے تیل سے چلنے والا اسٹوو بھی الگ سے لاکر رکھا گیا۔ چونکہ، گھر میں بجلی نہیں تھی، اس لئے پانی ٹھنڈا کرنے کی مشین (Refrigerator)، مسالے وغیرہ ملانے و پیسنے کی مشین (Mixer and grinder)، کپڑے دھونے کی مشین (Washing machine)، کپڑوں کی پریس (Press)اور رنگین ٹی۔وی وغیرہ بجلی سے چلنے والی چیزوں کا استعمال ممکن نہیں تھا۔لہٰذا شاہین کے ٹیلی ویژن دیکھنے کے لئے شہر سے ایک بیٹرے کا انتظام کیا گیا۔ کمروں میں بہتر روشنی اور گرمی کے موسم میں پنکھے و کولر (Cooler) کے استعمال کو ذہن میں رکھتے ہوئے ساجد نے پہلی فرصت میں بجلی کا کنکشن لے لیا۔ یہ بات الگ کہ کنکشن لینے میں اُسے بجلی دفتر کے کئی چکّر کاٹنے پڑے۔غرض ساجد نے شہری اور دیہاتی زندگی کے درمیان پائے جانے والے نمایاں فرق کو کم کرنے کے لئے وہ سب کچھ کیا، جو فی الحال وہ کرسکتا تھا۔

گھر میں شہروں جیسی کئی سہولتیں ہو جانے کے باوجود شاہین بہت زیادہ خوش دکھائی نہیں دیتی تھی۔اُس کا پھول جیسا نازک چہرہ خزاں کے موسم کی طرح بجھا بجھا سا رہتا تھا۔ اُس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی تھی کہ شادی سے قبل اُسے روزانہ شام کو پارک میں گھومنے، مآل میں شاپنگ کرنے، دوستوں کے ساتھ سنیما دیکھنے ،شام کا کھانا اکثر ریسٹورینٹ میں کھانے اور زندگی کو مکمل آزادی کے ساتھ ماڈرن طریقہ پر جینے کی عادت تھی۔گاؤں میں یہ سب ممکن نہیں تھا،اس لئے یہ سلسلہ یکسر بند ہو چکا تھا۔ شادی سے پہلے ساجد زیادہ تر پُرانی بائک سے شہر میں واقع دفتر جاتا تھا۔ دفتر جانے میں اُسے بس کا استعمال کرنے سے بھی کوئی گریز نہیں تھا۔ جب تب بس میں سوار ہوکر بھی شہر چلا جاتا تھا۔ بس میں سیٹ نہیں ملنے پر کھڑے ہوکر جانے کو بھی وہ کسرِ شان نہیں سمجھتا تھا۔روزانہ کتنے ہی لوگوں کو بس میں کھڑے ہوکر دفتر تک جانا پڑتا تھا۔ اُس نے بھی اس طرح کی عادت سی ڈال لی تھی۔

حالانکہ شاہین کے والدین نے اپنی بیٹی کو جہیز میں سبھی کچھ دیا تھا۔اس میں

قیمتی کار بھی شامل تھی، لیکن وہ کار کا استعمال کم سے کم کرتا تھا۔شاہین کے بار بار کہنے کے باوجود وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر کار سے دفتر جانے کو ٹال دیتا تھا۔ہاں اتنا ضرور تھا کہ جب کبھی شاہین کو ساتھ لے کر شہر جانا ہوتا تھا،تب وہ لگزری کار کا ہی استعمال کرتا تھا۔اس صورت میں ساجد شہر سے لوٹتے وقت شاہین کی مرضی کا خیال رکھتے ہوئے کافی کچھ سامان خرید کر ضرور لاتا تھا۔ اس سب کے باوجود شاہین کی زندگی میں کوئی خاص تغیر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

شاہین نے اپنے والد کے سامنے تو کبھی زبان نہیں کھولی،لیکن ماں سے قدیم و جدید نظریات ، شہر و دیہات کے امتیاز اور بے ربط ماحول کی شکایت کئی بار کی۔ساجد نے محسوس کیا کہ ماں باپ کے یہاں شاہین بہت خوش رہتی ہے،لیکن دیہاتی ماحول میں آتے ہی اُس کے چہرے سے مسکراہٹ اس طرح غائب ہو جاتی ہے،جس طرح دھوپ کی تمازت سے شاخ پر کھلا پھول کُملا جاتا ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آخر کار وہ دن بھی آ گیا، جب دِل کی بات زبان پر آ گئی۔ ساجد کے معلوم کرنے پر شاہین نے بغیر کسی جھجک کے شہر میں رہنے کی اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔

شاہین کی تمنّا معلوم ہوتے ہی ساجد کا چہرہ اُتر گیا،اُسے اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکتی محسوس ہوئی ۔شہر میں رہنے کا مطلب! گاؤں سے دوری اور گھر والوں سے کنارہ کشی۔ وہ اپنے ماں باپ، دادا،دادی اور بہن، بھائی کو اس طرح سے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھا۔اُس نے شاہین کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ’’شاہین !میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہوں۔اِس ناطے مجھ پر دادا، دادی اور ماں باپ کی بہتر دیکھ بھال اور بھائی، بہنوں کے شادی نکاح کی ذمہ داری بنتی ہے۔ میں نہ تو اپنی ذمہ داری سے منھ موڑ سکتا ہوں اور نہ ہی اُنہیں بے سہارا چھوڑ کر جا سکتا ہوں۔میں تمہاری خوشی کا ہر سامان مہیّا کرنے میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کر رہا ہوں۔ آئندہ بھی تمہاری ہر خوشی پوری کرنے کی سعی کرتا رہوں گا ۔ رہی بات شہر کی،تو تم جب چاہوگی، میں تمہیں تمہاری والدہ کے یہاں چھوڑ آیا کروں گا۔ شہر میں

نوکری کرنے کے باوجود میں اِنہیں کی خوشی کے لئے روزانہ گاؤں لوٹ آتا ہوں۔تم میری مجبوری کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہو۔ اِس صورت میں تمہیں میری مدد کرنی چاہئے۔''

''کیوں نہ ہم سب شہر میں شفٹ ہو جائیں؟'' شاہین نے برجستہ کہا۔

''نہیں شاہین! یہ ممکن نہیں ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔میری تنخواہ بھی اس کی اجازت نہیں دیتی۔'' ساجد نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''شہر میں میرے والد کے کئی مکان ہیں۔ہم اُن میں سے کسی ایک میں رہ سکتے ہیں۔ہمیں وہاں کسی قسم کی پریشانی بھی نہیں ہوگی۔'' شاہین نے ساجد کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہو۔اُن کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ سب تمہارا ہی ہے،لیکن میرا ضمیر اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ تمہیں ہر حال میں میرے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔'' ساجد نے اپنی بات پوری کی۔

میاں بیوی کے بیچ ہونے والی گفتگو کو ساجد کی چھوٹی بہن نے سن لیا۔بات ماں باپ کے کانوں تک پہنچ گئی۔ یہ سنکر ماں تو خاموش ہوگئی،لیکن باپ کا پارا چڑھ گیا۔اُنہوں نے بہت سختی سے بہو بیٹے کو شہر میں جا کر رہنے سے منع کر دیا۔دادا، دادی پُرانے خیالات کے ضرور تھے،لیکن وقت کی نزاکت کی بھی بہت اچھی پرکھ رکھتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے بیٹے اور بہو کو سمجھا بجھا کر ساجد و شاہین کو شہر میں جا کر رہنے کی خوشی سے اجازت دینے کو کہا۔تھوڑی حیل وحجت کے بعد ساجد کے والدین راضی ہو گئے۔

شاہین بہت خوش تھی۔ ہوتی بھی کیوں نہیں! آخر اُس کے من کی مراد پوری ہو رہی تھی۔ساجد نے چار دن بعد پڑنے والے اتوار کو شہر جانے کی بات کہی،لیکن شاہین اگلے دن ہی شہر جانا چاہتی تھی۔دادی نے ساجد کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ اُسے چار دن بعد بھی جانا ہے،کل ہی جانے میں کیا حرج ہے۔دادی کی زبان سے نکلے الفاظ کو حکم مان کر ساجد نے اگلے دن ہی گاؤں چھوڑنے کا پروگرام بنا لیا۔

شاہین کے چہرے کی خوشی دیکھتے ہی بنتی تھی۔اُس کی حالت گلشن میں شاخ در

شاخ پھدکتی چڑیا کی طرح تھی۔ گھنٹوں کا کام منٹوں میں کر لینے کے لئے گویا اُس کے ہاتھ مشین بن گئے تھے۔ دادی اپنی پوت بہو کی خوشی دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اُسے جہیز کے سامان سے کچھ لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ والدین کے یہاں اُسے کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ اُس نے صرف اپنے اور ساجد کے کپڑے وغیرہ ضروری سامان پیک کر لیا۔

بہو بیٹے کے گاؤں چھوڑنے کی گھڑی آ گئی۔ ساجد نے دروازے کے باہر کھڑی کار کی ڈکی میں سامان رکھ دیا۔ گھر والوں سے وداع لی اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ شاہین نے دادا، دادی، ساس اور سسر سے وداعی کلمات کہے۔ نندوں سے گلے ملی اور دیور کو پیار کیا۔ دادی اور ساس نے شاہین کو گلے لگا کر ڈھیر ساری دُعائیں دیں۔ انہوں نے کہا، ''بیٹا شاہین تم کسی حال سے ہو، اپنا خیال رکھنا۔ اپنے ساتھ ساجد کا بھی!!!''

شاہین گھر والوں کو سلام کرنے کے بعد کار میں آ بیٹھی۔ ساجد نے کار اسٹارٹ کی۔ گاڑی نے ابھی چند قدم کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ اچانک شاہین کے پیٹ میں مسوس ہونے لگی۔ اُس نے ساجد سے کار رُکوائی اور تیزی سے گھر لوٹتے ہوئے رفع حاجت کے لئے بیت الخلاء میں چلی گئی۔ گھر میں قدم رکھتے ہی شاہین نے جو کچھ دیکھا، اُس سے وہ حیرت میں پڑ گئی۔ گھر کا ہر فرد بے حد غمگین ہونے کے ساتھ ساتھ رو رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ساجد کی بہنیں دادی سے اور بھائی ماں سے لپٹا ہوا تھا۔ شاہین کو واپس آتے دیکھ سب اکدم سے الگ ہو گئے۔

کسی قدر سکون کے بعد باہر آئی شاہین کو دیکھ کر سب نے اُسے گھیر لیا۔ اُس سے اُس کی خیریت پوچھی۔ پیٹ میں درد کی بات معلوم ہونے پر مقامی ڈاکٹر کو دکھانے اور دوا لے کر کچھ دیر آرام کرنے کی صلاح دی۔

شاہین نے دادی، ساس، دیور اور نندوں کے چہروں کو دیکھا۔ حالانکہ اُنہوں نے اپنی گیلی آنکھیں پونچھ لی تھیں، لیکن آنکھوں میں کرب اور نم چہرے پر درد ابھی بھی

موجود تھا۔ اُس نے رونے کی وجہ دریافت کی، مگر کوئی بتانے کو تیار نہیں تھا۔

خوش دامنہ نے کہا، ''بیٹا! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس یوں ہی دِل بھر آیا تھا۔ سب ٹھیک ہے۔ اَللہ تمہیں اپنی پناہ میں رکھے اور ہر مصیبت سے بچائے!!''

شاہین نے نندوں کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ دونوں خاموش رہیں، مگر دیور سے چپ نہیں رہا گیا۔ اُس نے بغیر کسی کی پرواہ کئے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا، ''بھابی! آپ سے حقیقت چھپائی جا رہی ہے۔ ہم سب آپ کے لئے رو رہے تھے۔ بھیّا اور آپ کی جدائی ہماری برداشت سے باہر ہے۔''

دادی نے پوتے کی بات بیچ میں ہی کاٹ دی اور بولی، ''میری بچّی! تم اِس گھر کی بہو کے ساتھ ہماری بیٹی بھی ہو۔ ہماری عزّت اور اِس گھر کی شان ہو۔ تمہارے دُکھ درد کو ہم نہیں سمجھیں گے، تو پھر کون سمجھے گا؟ بچّوں کی خوشی میں ہی بڑوں کی خوشی ہوتی ہے۔ تمہیں دُکھی دیکھ کر ہم خوش کیسے رہ سکتے ہیں؟ حالانکہ تمہاری جدائی برداشت کرنا کافی مشکل ہے، لیکن وقت ہر درد کا مرہم ہے۔ ہمارا مذہب ہمیں ایک دوسرے کے لئے ہر ممکن قربانی دینے کے لئے تیار رہنے کی تعلیم دیتا ہے۔ دو ہی شکل تھیں۔ یا تو تم ہمارے لئے اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ دیتیں یا پھر ہم تمہاری خوشی پوری کرنے کے لئے اپنے جذبات کو قربان کر دیتے۔ اَللہ کا شکر ہے اُس نے ہمیں قربانی کی توفیق عنایت کی۔ میری پیاری شاہین! اگر درد میں افاقہ ہے، تو چلی جاؤ۔ ہماری دُعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ جاؤ! فی امانِ اللہ!!''

شاہین خاموش تھی۔ کچھ دیر پہلے وہ جس گھر کو چھوڑ کر چلی گئی تھی، واپسی پر معلوم ہوا کہ وہ گھر اینٹ اور سیمنٹ سے بنا صرف ایک گھروندا ہی نہیں ہے، بلکہ ایک ایسا گہوارہ ہے جس میں پیار واخوت کا لامحدود سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اس گھر کے لوگ آخر کس مٹّی کے بنے ہیں؟ اِنہیں ہر حال میں اُس کی فکر ہے۔ دوسری طرف وہ ہے جسے گھر کے کسی فرد کی پرواہ نہیں! کتنی خود غرض ہے وہ؟ افسوس! اُس نے آسمان کی طرح وسیع دِل والے دادا اور زمین کی طرح ہر حال میں

خوش رہنے والی دادی کی رتی برابر بھی فکر نہیں کی۔ اُس نے نہ تو ساس کی جانب سے ملنے والی ماں کی بیکراں محبت کی قدر کی اور نہ ہی سسر کی سمت سے عیاں باپ کی شفقت کو جاننے کی سعی کی ۔ وہ چھوٹے بھائی جیسے دیور کے چہرے کی مسکان پڑھنے میں تو ناکام رہی ہی، پیاری بہنوں کی طرح بے چوں چرا ہر حکم ماننے والی نندوں کے خلوص کو بھی سمجھ نہیں سکی۔

شاہین کا دل بھر آیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ''میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی، یہیں آپ لوگوں کے پاس رہوں گی،'' کہتے ہوئے شاہین، دادی و ساس سے لپٹ گئی۔ یہ دیکھ کر نندیں بھی اپنے آنسو نہیں روک پائیں اور بھابی سے چپٹ گئیں۔''

شاہین کے کافی دیر تک گھر سے باہر نہیں آنے پر ساجد گھر میں لوٹ آیا۔ بدلتے پسِ منظر کو دیکھ کر وہ حیران و ششدر رہ گیا۔ اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا، لیکن حقیقت کو جھٹلانا ممکن نہیں تھا۔

شاہین نے سب کا دِل دُکھانے کے لئے ایک بار پھر سب سے معافی مانگی اور کہا ''مجھے معاف کر دیجئے۔ ایک روز میں اکویریم میں قید ماہی کی آزادی اور بقا کے لئے اُسے کسی بڑے تالاب میں چھوڑ آنے کی سوچ رہی تھی، لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ تالاب اور جھیل ہی نہیں، بلکہ پیار و محبت کا بے کراں سمندر یہیں موجود ہے۔''

○○
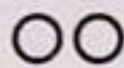
(اگست ۲۰۱۶ء)

بَدلہ

گاؤں کے قریب گذرنے والی نہر پر ڈاکوؤں کا گروہ دیکھے جانے سے مقامی لوگ بے حد خوف زدہ تھے۔قرب و جوار میں کافی بدنام اِس گروہ کو اِس سے قبل گاؤں کے اتنا قریب کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔یہ پہلا موقعہ تھا، جب خونخوار گروہ کے کئی مسلح افراد گاؤں کے باہر سے صاف طور پر چہل قدمی کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ پہلے بھی جب کبھی علاقہ میں شام ہوتے ہی ڈاکو دیکھے جانے کی اطلاع ملتی تھی، تو گاؤں والوں کی نیند اُڑ جاتی تھی۔ گھر اور اہلِ خانہ کی حفاظت کے لئے اُن کے سامنے رات بھر جاگ کر پہرہ دینے کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ نہیں رہتا تھا۔ اُنہیں ہر وقت یہ خوف ستاتا رہتا تھا کہ کہیں ڈاکوؤں کا گروہ کسی گھر پر حملہ نہ کر دیں۔گاؤں میں رہنے والے زیادہ تر لوگ کسان اور مزدور تھے۔کسان گاؤں کے زمیندار ناظم میاں کے کھیتوں میں فصلیں اُگاتے اور مزدور کھیتی باڑی کے کام میں اُن کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

گاؤں میں زمیندار صاحب کی پختہ حویلی کے علاوہ کسی اور شخص کا پکّا مکان نہیں تھا۔ دو چار لوگوں کے مٹّی کے ڈھیلوں یا کچی اینٹ کے کوٹھے (خام مکان) ضرور تھے، لیکن اُن کے سامنے بھی کھپریل یا پھر چھپّر ہی پڑے ہوئے تھے۔ دیہات کے باقی افراد اپنی اقتصادی حالت کمزور ہونے کی وجہ سے جھونپڑی نما چھپّر کے گھروں میں زندگی گذارنے پر مجبور تھے ۔ڈاکوؤں کی آمد پر یہ خدشہ بنا رہتا تھا کہ اگر کسی مکان میں لوٹ پاٹ نہ بھی کی گئی، تو کہیں گروہ کا کوئی شرارتی فرد کسی گھر میں آگ ہی نہ لگا دے

۔آگ لگنے کا مطلب تھا گھر میں موجود کپڑے لتّے، چارپائی، بستر، اناج، برتن اور کھانے پینے کے سامان کے علاوہ روزمرّہ کی دیگر ضروری اشیاء کا جل کر خاکستر ہو جانا۔ کھانا تیار کرتے وقت گھر کے چھپّر میں آگ لگنے کے کئی واقعات ہو چکے تھے۔ جس گھر میں آگ لگتی تھی، اُس کے آس پاس کے گھر تو اکثر آگ کی زد میں آتے ہی تھے، کبھی کبھی دُور کے گھر بھی نذرِ آتش ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک عورت سے کھانا بناتے ہوئے چولہے کے پاس پڑی گنّے کی سوکھی پتّی میں آگ لگ گئی۔ برابر والے گھر بھی آگ کی چپیٹ میں آ گئے۔ ہوا تیز تھی۔ گاؤں والوں نے آگ بجھانے کی بہت کوشش کی، لیکن آسمان چھوتی لپٹوں نے اُنہیں قریب نہیں آنے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورا گاؤں ہی آگ کی زد میں آ گیا۔ کوٹھوں کے سامنے پڑی کھپریل آگ سے گرم ہو کر چٹخنے لگی۔ کھپریل کے ٹکڑوں کے دور تک مار کرنے سے آگ پر قابو پانے میں دقّت آئی۔ چھپّر کا ایک بھی گھر محفوظ نہیں رہا۔ سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔ اُس سال لوگوں کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جلے گھروں کی مرمّت، لپائی پُتائی اور چھپّر تیار کرنے میں قریب مہینہ بھر لگ گیا تھا۔ تمام لوگوں کو کھُلے آسمان کے نیچے سونے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ حالانکہ زمیندار صاحب کی طرف سے مزدور و کسانوں کو مستعار رقم مہیّا کرائی گئی تھی، لیکن پھر بھی گھر کا ضروری سامان جُٹانے میں مہینوں لگ گئے تھے۔

حالانکہ ڈاکوؤں نے اَب تک گاؤں میں نہ تو کہیں ڈاکہ نہیں ڈالا تھا اور نہ ہی لوٹ پاٹ یا کسی گھر کو آگ لگانے جیسی واردات کو انجام نہیں دیا تھا، لیکن پھر بھی دیہاتیوں کے ذہن کسی انہونی کے خدشہ سے ہمیشہ دوچار رہتے تھے۔ گاؤں میں خوشی کا زبردست ماحول تھا۔ زمیندار ناظم میاں کی بیٹی سعدیہ بی کی شادی تھی۔ گاؤں کے علاوہ آس پاس کے دیہاتوں کے لوگ بھی بڑی تعداد میں مدعو کئے گئے تھے۔

خوشی کے پُرمسرت موقعہ پر ڈاکوؤں کی آمد کی خبر سے شادی کا خوشنما ماحول غمگین و نمناک ہو گیا۔ خوشی میں کھلے لوگوں کے چہروں کی رنگت تبدیل ہو گئی۔ آنکھوں میں ڈر کے سائے اور ماتھے پر خوف کی لکیریں اُبھر آئیں۔ جنگل میں آگ کی طرح

خبر گاؤں میں پھیل چکی تھی۔ ہر فرد فکر میں ڈوبا نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں آنکھوں میں گفتگو ہو رہی تھی۔ ہر ایک کی زبان پر ایک ہی سوال تھا، ''اَب کیا ہوگا؟'' گاؤں کے نزدیک ڈاکو دیکھے جانے کی اطلاع زمیندار صاحب تک بھی پہنچ گئی۔ خبر سُن کر زمیندار صاحب کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ زنان خانہ میں بھی اطلاع ہو گئی ۔ ڈاکوؤں کی آمد کی منحوس خبر سُنتے ہی زمیندار نی شاہدہ بے ہوش ہو گئی۔ ہر طرف افراتفری مچی تھی ۔ گروہ آنے کی اطلاع دُولہن کے سُرخ جوڑے میں ملبوس سعدیہ بی کے کانوں میں بھی پڑی۔ اُسے یقین نہیں آیا۔ وہ سمجھی اُس کی سہیلی مذاق کر رہی ہے، لیکن خبر سچ تھی۔ سعدیہ بی کے گلنار چہرے کی رنگت اُڑ گئی۔ گلگوں رُخساروں کی سُرخی یکسر غائب ہو گئی۔ لالی پر سفیدی حاوی ہونے کے باوجود اُس نے اپنی ہمت کو بکھرنے نہیں دیا۔ زبان سے نکلا، ''عاصم!'' نہیں !! یہ نہیں ہو سکتا!!! لوگوں کو دھوکا ہوا ہے۔ عاصم کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔ سعدیہ بی نے خود کو تسلّی دینے کی ناکام کوشش کے ساتھ کانوں میں پڑی آواز کو جھٹلانے کی سعی کی، لیکن حقیقت کو جھٹلانا ممکن نہیں تھا۔ عاصم کا گروہ دیکھے جانے کی اطلاع سے سعدیہ بی کو قلبی تکلیف پہنچی۔ اُس کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ ایک دِن ایسی منحوس خبر سننے کو ملے گی۔

زمیندار صاحب کو اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی کا بڑا ارمان تھا۔ اسی کے مدِ نظر زوردار تیاریاں کی گئی تھیں۔ قرب و جوار کے سبھی دیہاتوں میں دعوت نامے بھیجے گئے تھے۔ بڑے گھرانوں سے تعلق رکھنے والے حضرات بھی نکاح کی شاندار تقریب میں شرکت کرنے آئے تھے۔ زمیندار صاحب کے نزدیک کے کئی لوگوں کو سعدیہ بی کے نکاح میں رخنہ کا اندیشہ تھا۔ اِس بابت زمیندار صاحب کو آگاہ کر ہوشیار رہنے کی صلاح دی جا چکی تھی۔ زمیندار صاحب کو عاصم کے اِس حد تک آنے کی اُمّید نہیں تھی۔ شاید اِسی لئے اُنھوں نے پولس کو خبر دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ خاندان کی بے عزّتی اور اپنے وقار کے مجروح ہونے کے خوف نے بھی اُنہیں ایسا کرنے سے باز رکھا۔ قاضی جی نے نکاح پڑھا دیا تھا۔ نکاح کی تقریب میں شامل حاضرین نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر

دُولہا و دُولہن کو مبارکباد کے علاوہ اُن کی ازدواجی زندگی خوشگوار رہنے کی دُعائیں دیں۔ نکاح کی رسم کے بعد طعام کا نظم تھا۔ سبھی حضرات کو کھانا کھلایا گیا۔ برات اور مہمانوں کے ساتھ میزبان بھی کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ دُولھن کے وداع ہونے کی تیاری شروع ہو گئی تھی، عین اُسی وقت ڈاکوؤں کا گروہ دکھائی دینے کی افسوسناک خبر آئی۔ اِس خبر نے ہر شخص کو صدمہ سے دوچار کر دیا۔

عاصم کھیڑا گاؤں کا ہی رہنے والا تھا۔ اُس کا باپ صائم زمیندار صاحب کے کھیتوں میں مزدوری کرتا تھا۔ ماں نغمہ زمیندار صاحب کے گھر میں جھاڑو لگانے، کپڑے دھونے، برتن مانجنے اور اناج وغیرہ کی صفائی کے علاوہ کھانا تیار کرنے میں زمیندارنی صاحبہ کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ ایک روز صائم پھاوڑے سے کھیتوں میں کھڑی جھاڑیاں کاٹ رہا تھا۔ اچانک جھاڑی میں چھپے بیٹھے سانپ نے صائم کو ڈس لیا۔ سانپ کے کاٹتے ہی برابر میں کام کرنے والے ایک مزدور نے پھاوڑے کا زوردار وار کرتے ہوئے سانپ کو مار ڈالا۔ کھیت میں کام کرنے والے تمام مزدور اکٹھا ہو گئے۔ ایک مزدور دوڑ کر پاس کے گاؤں پہنچ گیا اور جھاڑ پھونک کرنے والے سپیرے کو ساتھ لے آیا۔ سپیرے نے ہر ممکن کوشش کی، لیکن کوئی تدبیر کام نہ آئی۔ صائم کو بچایا نہیں جا سکا۔ صائم کی موت سے نہ صرف اُس کے گھر، بلکہ گاؤں میں ماتم چھا گیا۔ عاصم اور نغمہ کا روتے روتے بُرا حال تھا۔ آخر کار گاؤں والوں کی اتفاقِ رائے سے صائم کے مردہ جسم کو نہلانے کے بعد میّت کو کفن میں لپیٹا گیا۔ لوگوں نے صائم کے آخری دیدار کیے۔ ظہر کی نماز کے بعد مسجد کے سامنے کے میدان میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ جلوس کی شکل میں جنازہ قبرستان پہنچا اور میّت کو قبر میں اُتار کر دفن کر دیا گیا۔

آٹھ برس کی کم عمر میں باپ کا سایہ اُٹھ جانے سے عاصم یتیم ہو گیا۔ جوانی میں بیوہ ہوگئی اپنی اُداس ماں کو دیکھ کر عاصم غمگین رہنے لگا۔ وہ گاؤں کے پرائمری اسکول میں تیسری جماعت کا طالب علم تھا۔ اُسی اسکول میں زمیندار صاحب کی اکلوتی بیٹی سعدیہ بی بھی زیرِ تعلیم تھی۔ ہم جماعت ہونے کے سبب عاصم اور سعدیہ بی میں کسی حد تک

قربت بڑھ گئی تھی۔ اکثر دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے، وقت پر کلاس ورک کرنے کے علاوہ ہوم ورک بھی بروقت نپٹا لیتے۔ کبھی عاصم اپنی ماں کے ساتھ حویلی میں آجاتا اور کبھی سعدیہ بی بھی نغمہ کے ساتھ اُن کے گھر چلی جاتی۔ باپ کا سایہ سر سے اُٹھنے کی وجہ سے عاصم کئی دِن تک اسکول نہیں گیا۔ سعدیہ بی بھی عاصم کے غم میں برابر کی شریک دیکھی گئی۔

نشیب و فراز والی زندگی کی اُوبڑ کھابڑ پگڈنڈیوں میں لگنے والی چوٹ اور زخموں کا واحد علاج وقت ہی ہے۔ وقت نے عاصم اور نغمہ کے زخموں پر بھی مرہم رکھ دیا۔ وقت کے ساتھ سمجھوتہ کر لینے سے حالات معمول پر آنے لگے۔ عاصم نے اسکول جانا شروع کر دیا اور نغمہ زمیندار صاحب کی حویلی میں اپنے کام پر لوٹ آئی۔ وقت گزرتا رہا ۔ عاصم اور سعدیہ بی نے گاؤں کے ہائی اسکول سے دسویں کلاس کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کر لیا۔ آگے کی تعلیم کا انتظام گاؤں میں نہیں تھا۔ آگے کی پڑھائی شہر جائے بغیر ممکن نہیں تھی ۔ زمیندار صاحب سعدیہ بی کو شہر بھیجنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ خاندانی اَنا کا سوال آڑے آ گیا۔ مطلب بالکل صاف تھا۔ سعدیہ بی کی پڑھائی کا سلسلہ اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔ تعلیم کا سلسلہ بند ہونے سے سعدیہ بی بہت اُداس رہنے لگی، لیکن نقار خانہ میں طوطی کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ زمیندار صاحب کا فیصلہ آخری اور نا قابلِ تبدیل تھا۔ سعدیہ بی نے ماں کے سامنے آگے پڑھنے کی تجویز پیش کرتے ہوئے باپ کو سمجھانے کی خوب منت و سماجت کی۔ زمیندارنی صاحبہ بیٹی کا درد اچھی طرح سمجھتی تھی، لیکن وہ اِس ضمن میں کچھ کرنے سے عاری تھی۔ سعدیہ کی تعلیم پر پابندی لگنے سے عاصم بھی اُداس تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سعدیہ کی پڑھائی جاری رہے۔ وہ خوب ترقّی کر اپنے ماں باپ اور خاندان کے ساتھ گاؤں کا نام بھی روشن کرے، لیکن قسمت کو یہ سب منظور نہیں تھا۔

عاصم، نغمہ کا خواب تھا۔ وہ اُسے ہر حالت میں پڑھانا اور ایک قابل انجینئر بنانا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ جب اُس کا بیٹا اپنی تعلیم پوری کر گاؤں لوٹے، تب اُس کے

پاس ایک ایسا ہنر ہو، جو گاؤں کی قسمت بدل دے۔گاؤں کو ترقّی کی سمت لے جائے، گاؤں کو جھونپڑی اور چھپّروں کے جھنجھٹ سے آزاد کرادے۔ گھروں میں بار بار آگ لگنے کے خطرے کو ہمیشہ کے لئے ختم کردے۔ کم لاگت سے تیار ہونے والے پکّے مکانوں کا ایسا نقشہ بنائے کہ لوگ اُن میں خود کو محفوظ اور خوش وخرم محسوس کرسکیں۔
سعدیہ بی جہاں اپنی تعلیم بند ہونے سے غمگین تھی، وہیں اُسے اِس بات کی خوشی تھی کہ عاصم کی ماں نے اپنے لختِ جگر کو مزید تعلیم دلانے کے لئے شہر بھیجنے کا تہیّہ کرلیا ہے۔ نغمہ نے جی توڑ محنت کے بعد اپنی تمام تر خواہشوں کا گلا گھونٹتے ہوئے عاصم کے مستقبل کے لئے تقریباً دو ہزار روپئے جمع کر رکھے تھے۔یہ رقم اَب اُس کی پڑھائی میں کام آنے والی تھی۔

زمیندار صاحب کو یہ اچھا نہیں لگا کہ ان کی بیٹی سعدیہ بی کی پڑھائی تو بند ہو جائے اور اُس کے گھر میں کام کرنے والی معمولی نوکرانی کا بیٹا اُن کے کھیتوں میں کام کرنے کی بجائے شہر پڑھنے چلا جائے۔وہ اپنی تنگ سوچ کے دائرہ کو وسعت نہیں دے سکے۔اُن کے خیال میں اگر نغمہ کی طرح گاؤں کے دیگر کسان اور مزدور اپنے بچّوں کو تعلیم کے لئے شہر بھیجنے لگیں گے، تب اُن کے کھیتوں کا کیا ہوگا؟ کھیتی باڑی کون کرے گا؟ پڑھ لکھ کر نئی نسل مکمل طور پر آزاد ہو جائے گی۔گاؤں میں اُن کی جی حضوری اور بیگار کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔وہ اپنی بادشاہت کو ختم ہوتے دیکھنے کو تیار نہیں تھے۔اُنہیں لگا کہ اگر وقت رہتے اِس پر روک نہیں لگائی گئی، تب عاصم سے شروع ہو نے والے سلسلہ پر لگام لگانا مشکل ہو جائے گا۔آج عاصم جا رہا ہے، کل قاسم جائے گا، پھر کریم، حامد، احسن اور نہ جانے کون کون......؟ اِس سے قبل کہ ایک کے بعد ایک نوجوان کے گاؤں سے شہر جانے کا سلسلہ شروع ہو، اِسے روکنا بہت ضروری ہے۔ اُن کا ذہن آنے والے کل کے خطرے کا توڑ تلاش کرنے میں لگ گیا۔

عاصم آگے کی تعلیم کے لئے ضروری داخلہ امتحان میں کامیاب ہو گیا تھا۔ انجینئرنگ کالج میں داخلے کا اطلاع نامہ موصول ہونے سے ماں بیٹے بہت خوش تھے۔

نغمہ نے عاصم کو شہر بھیجنے کی تیاری شروع کر دی۔ اُس کے لئے دو جوڑی نئے کپڑے بنانے کے علاوہ بستر اور روز مرّہ کے کام آنے والی چند چیزوں کا انتظام بھی کر دیا۔ حالانکہ کالج میں داخلہ کے بعد عاصم کو ہوسٹل میں رہنا تھا۔طلباء کے طعام و قیام کا انتظام ہوسٹل میں ہونے سے نغمہ کافی پُر سکون تھی۔ آخر کار وہ دِن آ گیا، جب عاصم کو گاؤں کے پُر سکون و پیار بھرے ماحول کو الوداع کہہ کر شہر کی گہما گہمی والی رنگین فضاء میں داخل ہونا تھا۔نغمہ نے بیٹے کے ساتھ کالج اور ہوسٹل تک جانے کا فیصلہ کیا۔ عاصم صبح کو جلدی اُٹھ گیا۔ نہا دھو کر تیار ہونے کے بعد سب سے پہلے حویلی میں زمیندار صاحب اور زمیندارنی صاحبہ کو سلام کرنے گیا۔زمیندارنی صاحبہ اور سعدیہ بی عاصم کو دروازے تک چھوڑنے آئیں۔ وداع کے مشکل لمحات میں سعدیہ بی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ عاصم کا صبر بھی جواب دے گیا۔اُس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ کچھ دیر کے لئے عاصم ٹھہرا اور پھر خُدا حافظ کہتا ہوا حویلی کے گیٹ سے باہر نکل آیا۔گاؤں کے لوگوں اور اپنے دوستوں سے رخصت ہو کر ماں کے ساتھ بستی سے باہر آیا۔قریب پانچ کلو میٹر کا سفر پیدل طے کرنے کے بعد شہر جانے والی سڑک تھی۔سڑک پر بسوں کی آمد و رفت کم تھی۔بس اُسی صورت میں رُکتی تھی، جب کوئی مسافر بس کو ہاتھ دے کر روکتا تھا یا بس میں سوار کوئی شخص بس سے اُترتا تھا۔

کئی کلو میٹر کے فاصلے پر چوراہا تھا۔چوراہے پر کچھ ہی مسافر تھے،لیکن سڑک کے بیچ میں ایک داروغہ پانچ سپاہیوں کے ساتھ کھڑا بَس روکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ عاصم اور نغمہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر پولیس بیچ راستے میں اِس طرح کیوں کھڑی ہے؟ اُنہوں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے پولیس کو بھی بَس میں سوار ہو کر کہیں جانا ہو۔ ڈرائیور نے بَس روک دی۔ مسافروں سے پہلے پولیس بَس میں داخل ہوئی۔داروغہ نے ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا نچاتے ہوئے مسافروں پر ایک نظر ڈالی اور پوچھا۔

"عاصم کون ہے؟"

عاصم اپنا نام سن کر حیران رہ گیا۔وہ سمجھا بَس میں پہلے سے بیٹھے مسافروں میں

کوئی اور عاصم ہوگا، جس کی پولیس کو تلاش ہے۔وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ داروغہ نے دوبارہ کڑک دار آواز میں معلوم کیا۔

''عاصم کون ہے؟ کھیڑا گاؤں کا عاصم! جلدی بتاؤ ورنہ......''

عاصم اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا۔''کھیڑا کا رہنے والا عاصم تو میں ہوں، داروغہ جی! میں شہر کے انجینئرنگ کالج میں داخلہ لینے جا رہا ہوں۔ کیا بات ہے؟ بتائے۔'' عاصم نے مختصر سا جواب دیا۔

نغمہ نے بھی عاصم کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا،'' داروغہ جی یہ مجھ بیوہ کا بیٹا ہے۔ شہر پڑھنے جا رہا ہے۔ برائے مہربانی بتایئے کیا معاملہ ہے؟''

داروغہ نے عاصم پر ایک نظر ڈالی اور کہا،'' اِس نے کھیڑا گاؤں کے زمیندار ناظم میاں کی حویلی میں گھس کر زمیندار صاحب پر چاقو سے جان لیوا حملہ کیا ہے۔ اِسے ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔''

عاصم نے اپنے اُوپر لگائے گئے الزام کی تردید کی۔ نغمہ نے کہا،'' داروغہ جی! یہ جھوٹ ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا بیٹا کسی بھی صورت میں ایسی حرکت نہیں کر سکتا!! یہ بہت نیک اور ایماندار لڑکا ہے۔ گاؤں والے اِس کی شرافت کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ آج اِس کا داخلہ ہونا ہے۔ میرے بیٹے کے مستقبل کا سوال ہے۔ مہربانی کر کے ہمیں جانے دیں۔''

''میں مجبور ہوں محترمہ۔ زمیندار صاحب نے آپ کے بیٹے کے خلاف رپورٹ لکھائی ہے۔ رپورٹ میں درج تحریر کے مطابق ہم کارروائی کرنے پر مجبور ہیں۔ آپ کا بیٹا گنہگار ہے یا نہیں، اِس کا فیصلہ عدالت کرے گی۔ آپ سرکاری کام میں مداخلت نہ کریں۔ ہمیں اپنا کام کرنے دیں۔ ہم اِسے تھانے لے جا رہے ہیں۔'' داروغہ نے اپنی بات پوری کرتے ہوئے عاصم کو گرفتار کر لیا اور سرکاری جیپ میں بیٹھا کر اپنے ساتھ تھانے لے گئے۔

عاصم نے تھانے کے انچارج انسپکٹر کے سامنے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی

بہت کوشش کی، لیکن اُس کی ایک نہ چلی۔ عاصم کے خلاف قتل کے ارادے کا الزام عائد کرتے ہوئے چارج شیٹ لگا کر اُسے جیل بھیج دیا گیا۔

نغمہ کا روتے روتے بُرا حال تھا۔ اُسے اپنی آنکھوں میں بسے خواب چکنا چور ہوتے نظر آئے۔ وہ اپنی بے بسی پر روتی رہی۔ اُسے صائم کی بہت یاد آئی۔ اُسے آج محسوس ہوا کہ شوہر کے بغیر کسی رانڈ کا جینا کتنا مشکل ہوتا ہے؟ وہ دوسرا نکاح کر سکتی تھی، لیکن بیٹے کی بہتر پرورش اور سوتیلے باپ کے ناخوشگوار رویّہ کے خوف سے ایسا نہ کر سکی۔ حسین جوانی کے خوبصورت ایام سفید کپڑوں میں گذار دئے۔ بیٹے کی مناسب تربیت کے لئے مقدور بھر قربانی دی۔ عاصم کو کسی قابل بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ نغمہ نے گاؤں کی بدتر حالت کی تبدیلی کے سپنے کو بیٹے کی تعلیم سے جوڑ رکھا تھا، لیکن اَب سب کچھ بکھر کر رہ گیا۔

وہ روتے روتے حویلی پہنچی۔ زمیندارنی صاحبہ نغمہ کو روتے دیکھ کر پریشان ہوگئی اور خود چل کر اُس کے پاس آئیں۔

سبب پوچھنے پر پھوٹ پھوٹ کر روتی نغمہ نے زمیندار صاحب پر ہوئے قاتلانہ حملہ کا تذکرہ زمیندارنی صاحبہ سے کیا۔ حملہ کی بات سن کر زمیندارنی صاحبہ چونک گئیں۔ اُنہوں نے حویلی میں اِس طرح کے کسی بھی واقعہ سے صاف انکار کرتے ہوئے کہا، "یہ سب جھوٹ ہے۔ تم نے غلط سُنا ہے یا پھر کسی نے تم سے بہت ہی بیہودہ مذاق کیا ہے۔ اللہ کے فضل سے زمیندار صاحب بالکل ٹھیک ہیں۔ اَب تم گھر جاؤ اور آرام کرو۔"

"کیسا آرام مالکن! بیٹا جیل چلا گیا اور یہ دِن دیکھنے والی بدنصیب ماں زندہ ہے۔ آپ کہتی ہیں گھر چلی جاؤں، آرام کر لوں۔ آپ ہی بتائیں کہ کیا مجھ دکھیاری کو اس حالت میں سکون مل جائے گا؟" عاصم کے جیل جانے کی بات سُن کر زمیندارنی صاحبہ حیران رہ گئیں۔ اتنے میں سعدیہ بی بھی اپنے کمرے سے باہر آگئی۔ عاصم کے جیل جانے کی خبر نے اُسے بھی سکتہ میں ڈال دیا۔

زمیندارنی نے نغمہ کو تسلّی دیتے ہوئے کہا،''نغمہ تُو فکر مت کر۔میں ابھی زمیندار صاحب سے کہتی ہوں۔وہ عاصم کو جیل سے چُھڑا لیں گے۔''

''آپ بھی کمال کرتی ہیں زمیندارنی صاحبہ!زمیندار صاحب میرے بیٹے کو کیسے رہا کرا لیں گے؟اُنہوں نے ہی تو عاصم کو جیل بھجوایا ہے۔'' اتنا کہہ کر نغمہ نے پھر رونا شروع کر دیا۔

''کیا بکتی ہے تُو؟عاصم ہمارے بیٹے کی طرح ہے۔میری سعدیہ بی کے ساتھ پلا، بڑھا اور پڑھا ہے وہ!! الزام لگانے سے پہلے کچھ سوچ تو لیتی۔آخر کیا کہہ رہی ہے؟ اور کس پر الزام لگا رہی ہے؟تو ہمارے گھر میں کام ضرور کرتی ہے،لیکن ہم تم دونوں ماں بیٹے کی سادگی اور نیک نیتی کی وجہ سے تمہیں بہت چاہتے ہیں۔جب سے تمہارا شوہر ہمارے کھیت میں کام کرتے ہوئے،سانپ کے کاٹنے سے مرا ہے،تب سے ہم تمہیں اپنے گھر کے افراد جیسا ہی مانتے ہیں۔''اتنا کہہ کر زمیندارنی صاحبہ خاموش ہوئی ہی تھیں کہ زمیندار صاحب حویلی کے اندر داخل ہوئے۔

اُنہوں نے کہا،''ٹھیک کہہ رہی ہے نغمہ۔اُس کا بیٹا جیل میں ہے اور ہم نے ہی اُسے وہاں تک پہنچایا ہے۔چوری اور قاتلانہ حملے کے الزام میں!!شہر کی پڑھائی پوری کرنے کے لئے اُسے روپیوں کی سخت ضرورت تھی۔گذشتہ رات وہ حویلی میں چوری کرنے کے ارادے سے داخل ہوا۔ہماری آنکھ کھلنے پر اُس نے ہم پر چاقو سے حملہ کرتے ہوئے ہماری جان لینے کی جرأت کی۔وہ ہم سے چھوٹ کر بھاگ نکلنے میں تو کامیاب ہو گیا،لیکن پولیس کے لمبے ہاتھوں سے نہیں بچ سکا۔آخر پولیس نے اُسے گرفتار کر جیل بھیج دیا۔جو جیسا کرتا ہے،ویسا ہی بھرتا ہے۔''

''نہیں!! یہ جھوٹ ہے۔میرا بیٹا ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔وہ چور یا لُٹیرا نہیں ہے۔''کہتی ہوئی نغمہ حویلی سے باہر نکل گئی۔

عاصم پر لگائے گئے الزام پر کوئی یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔لیکن زمیندار صاحب کے خلاف لب کشائی کی ہمت بھی کسی میں نہیں تھی۔نغمہ سدھ بدھ کھو چکی تھی۔

گاؤں والوں نے اُسے کبھی روتے اور کبھی خوب کھلکھلا کر ہنستے دیکھا۔ اُس کی پاگلوں جیسی حالت دیکھ کر ہر کوئی سکتہ میں تھا۔ اُس دِن کے بعد نغمہ گاؤں میں دکھائی نہیں دی۔

عدالت میں جھوٹی گواہی کی بدولت ناکردہ گناہ کی سزا کاٹ کر جیل سے چھوٹنے کے بعد عاصم گاؤں میں نہیں گیا۔ جاتا بھی کیسے!! چوری اور آمادۂ قتل کے الزام میں ماتھے پر لگے سزا کے داغ نے گاؤں کا راستہ اُس کے لئے بند کر دیا تھا۔ ماں کے پاگل ہوکر کہیں چلے جانے کے بعد یوں بھی گاؤں میں اُس کے لئے کچھ نہیں بچا تھا۔ اِن حالات میں سعدیہ بی بھی اُس کی بے گناہی کو شاید تسلیم نہیں کرتی۔ پڑھائی ختم ہو چکی تھی اور خیالوں کا محل تعمیر ہونے سے قبل ہی گر چکا تھا۔ اَب زندگی کی اندھیری سرنگ ہی اُس کا ٹھکانہ تھی۔ اُس نے بے سمت منزل کی طرف دوڑنے کا تہیّہ کر لیا۔

عاصم کی یہ حسرت جلدی ہی پوری ہوگئی۔ جنگل میں اُس کی ملاقات ماجد گینگ سے ہوگئی۔ عاصم کی آپ بیتی سن کر ماجد نے اُسے اپنے ساتھ اپنی تربیت میں لے لیا۔ اُسے بھی زمیندار سے کوئی پرانا حساب چکتا کرنا تھا۔ ماجد کے زیرِ سایہ عاصم جلدی ہی بدنام دُنیا کا بے تاج بادشاہ بن گیا۔ کئی ضلعوں میں عاصم کے خوف اور دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ علاقہ کے لوگ اُس کے نام سے خوف زدہ رہنے لگے۔ زمیندار صاحب کو بھی عاصم سے بدلہ لینے کا ڈر ہر وقت ستاتا رہتا تھا۔

اچانک ڈاکوؤں کا گروہ ایسے غائب ہو گیا جیسا کہ کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ ڈاکو نظر نہیں آنے سے گاؤں والوں کو تسلّی ہوئی۔ سعدیہ بی کو وداع کر دیا گیا۔ زمیندار صاحب نے اپنے خاص اور چنیدہ لوگوں کو بطور حفاظت برات کے ساتھ بھیج دیا۔ گاؤں سے کئی کلومیٹر دُور نکل جانے کے بعد جھٹکا ہو گیا۔ شام گہراتے ہی گولیوں کی آواز سے جنگل گونج گیا۔ ڈاکوؤں نے برات کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ڈاکوؤں کے حملے اور گھیرابندی سے براتیوں کی حالت غیر ہو گئی۔ ہاتھوں میں بندوق لئے کئی ڈاکو آگے بڑھے اور دولہا و دولھن کو اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ براتیوں کے قتلِ عام

سے خوف زدہ دولہا اور دولھن ڈاکوؤں کے ساتھ ہو لئے۔ سردار کے خیمہ میں دولہا کے باپ کو بھی طلب کیا گیا۔ عاصم نے سعدیہ بی اور سعدیہ بی نے عاصم کو دیکھا۔ بہت دیر تک دونوں ایک دوسرے کو ایک ٹک دیکھتے رہے۔ خیمہ میں عجیب سی خاموشی تھی۔ عاصم کی سُرخ آنکھوں میں نفرت اور بدلہ کی آگ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ آخر سعدیہ بی نے ہی سکوت توڑا، ''عاصم! مجھے تم سے یہ اُمید نہیں تھی۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میرے باپ کی طرح تم بھی اپنی سطح سے گر جاؤ گے!! کیا فرق رہ گیا دونوں کے درمیان؟ اُنہوں نے تمہاری زندگی تباہ کی اور اَب تم میری زندگی اُجاڑو گے!! خیر اَب انتظار کس بات کا ہے؟ چلو اپنا کام شروع کرو! دیکھ کیا رہے ہو؟ آگے بڑھو اور نوچ ڈالو میرے بدن کے کپڑے! اُجاڑ دو میرا سہاگ!! بجھالو اپنی پیاس!!! چلاؤ گولی اور لے لو اپنی بربادی کا بدلہ۔''

عاصم آگے بڑھا۔ اُس کے ہاتھوں میں لکڑی کا ایک چھوٹا ڈبہ تھا۔ سب متحیر تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ عاصم سعدیہ بی کے ٹھیک سامنے جا کر رُک گیا۔ اُس نے ایک نظر سعدیہ بی پر ڈالی۔ پھر اُس کے شوہر کی طرف دیکھا۔ آخر میں دولہا کے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، ''زمیندار صاحب! میں ایک بدنام ڈاکو ہوں۔ کھیڑا نہیں جا سکتا تھا۔ سعدیہ بی اور میں بچپن سے بڑا ہونے تک ساتھ کھیلے، ساتھ پڑھے اور ساتھ ہی بڑے ہوئے۔ قسمت میں آگے کے راستے الگ لکھے تھے۔ سعدیہ گاؤں کی زینت بنی رہی اور میرا مقدر مجھے بھٹکنے کے لئے بیہڑ کے جنگلات میں لے آیا۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوا میں اُسے یاد رکھنا نہیں چاہتا۔ اِس ڈبہ میں سونے کا ہار ہے۔ میری ماں کی نشانی۔ اُس کی شادی کی یادگار۔ میری ماں کالج میں میرا داخلہ کرانے کے لئے اِسے لے کر میرے ساتھ شہر جا رہی تھی۔ دو ہزار روپے بھی ہیں، جو اُس نے میری پڑھائی کے لئے اپنا پیٹ جون کاٹ کر جوڑے تھے۔ سزا کاٹ کر جیل سے باہر آتے وقت جیلر صاحب نے میرے سامان کے ساتھ اِنہیں مجھے لوٹا دیا تھا۔ ماں کی امانت کو میں نے سنبھال کر رکھا ہے۔ یہ ہار میری بہن کے لئے ہے اور روپے

میرے بہنوئی کی نذر۔ اپنی اس چھوٹی سی خواہش کی تکمیل کے لئے میری جانب سے آپ لوگوں کو جو تکلیف پہنچی ہے، اُس کے لئے میں دِل سے معذرت خواہ ہوں،'' یہ کہتے ہوئے عاصم نے لکڑی کا ڈِبّہ زمیندار صاحب کے ہاتھو میں رکھ دیا۔ اُس نے سعدیہ بی اور دولہا عادل کے سر پر ہاتھ رکھ کر ہمیشہ خوش رہنے کی دُعائیں دیں اور خیمے سے باہر نکل گیا۔

OO

(اکتوبر ۲۰۱۶ء)

چاک کا بوسیدہ ٹکڑا

ماسٹر صاحب دُودھ اور بسکٹ وغیرہ ناشتہ کا ضروری سامان بازار سے خرید کر گھر لوٹ آئے تھے۔ بڑی بہو سیما نے اُنہیں دروازے سے آتے دیکھ بڑی معصومیت سے کہا، ''پتا جی! آپ کے گھر سے نکل جانے کے بعد دھیان آیا کہ کچن میں نمک موجود نہیں ہے۔آپ تو جانتے ہی ہیں کہ نمک کے بغیر پراٹھے تو بن جائیں گے،لیکن آلو کی سبزی بے مزہ رہے گی۔ نمک ہی کھانے کو ذائقہ دار بناتا ہے۔آپ کو زحمت تو ضرور ہوگی،لیکن مارکیٹ جائے بغیر کام نہیں چلے گا۔مہربانی کر کے ایک بار اور بازار چلے جائیں ۔جب تک آپ مارکیٹ سے لوٹ کر آئیں گے،تب تک میں آپ کے لئے سوجی کا حلوا اور چائے بنا کر لے آتی ہوں۔''

ماسٹر صاحب خاموش رہے۔ایسا پہلی بار نہیں ہو رہا تھا۔اُن کے ساتھ اس طرح کا عمل اکثر ہوتا رہا ہے۔ بازار جانے آنے میں تھک سے گئے ماسٹر صاحب اچھی طرح جانتے تھے کہ اَب اُنہیں کیا کرنا ہے؟ اُنہوں نے بازار سے لائے دودھ اور سامان کا پیکٹ میز پر رکھ دیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اُلٹے پاؤں گھر سے باہر نکل گئے ۔تھوڑی دیر بعد وہ نمک کا پیکٹ ہاتھ میں لئے واپس آ گئے۔ایک کے بعد ایک بازار کے دو چکّر لگانے سے اُن کی سانس پھول آئی تھی،لیکن اُن کی اِس کیفیت سے گھر میں کسی کو رتی بھر بھی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔

تھکے ہارے ماسٹر صاحب ابھی ٹھیک سے صوفے پر بیٹھے بھی نہیں تھے کہ چھوٹی

بہو ششما دندناتی ہوئی برآمدے میں داخل ہوئی اور اپنے سسر کے سامنے کھڑی ہو کر بڑے ناز و انداز سے بولی، ''پتا جی! آپ سے کتنی بار کہا ہے کہ آپ جب بازار جایا کریں، تو ہم سے بھی معلوم کر لیا کریں۔ کچھ منگانا تو نہیں ہے؟ ہمیں بھی بازار سے روز مرّہ استعمال میں آنے والا ضروری سامان منگانا پڑ سکتا ہے!! اَب دیکھئے نہ، اگر آپ مارکیٹ جانے سے قبل ایک بار ہم سے بھی معلوم کر لیتے، تو آپ کے پھر سے بازار جانے کی نوبت نہیں آتی۔'' یہ کہہ کر ششما، جس تیزی سے کمرے سے باہر آئی تھی، اُسی تیزی سے اپنے کمرے میں واپس چلی گئی۔

''میں نے پوچھا تھا بیٹی۔ لیکن تم نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں سمجھا کہ آج شاید ششما بیٹی کو مارکیٹ سے سودا سلف نہیں منگانا ہے۔'' کسی طرح اتنا کہہ کر ماسٹر صاحب خاموش ہوئے اور ستانے کی غرض سے صوفے پر پسر گئے۔ ایک بار پھر بازار جانے کی فکر اُنہیں ستانے لگی۔

بڑی بہو سیما نے سسر کے سامنے میز پر گرم چائے اور حلوے کی پلیٹ رکھ دی۔ میز پر پڑا نمک کا پیکیٹ اُٹھایا اور کچن میں چلی گئی۔ ماسٹر صاحب نے ایک چمچ حلوا منھ میں ڈالا اور چائے سِپ کرنے کے لئے کپ کو ہاتھ میں اُٹھا کر ہونٹوں سے لگایا۔ اَبھی وہ چائے کا گھونٹ ٹھیک سے بھر بھی نہیں پائے تھے کہ ششما طوفان کی طرح پھر اُن کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

چھوٹی بہو نے سسر پر حکم صادر کرتے ہوئے فرمایا، ''پتا جی آپ کے بیٹے راجیش دفتر جانے سے بیٹھے ہیں۔ شیونگ کے لئے نیا بلیڈ نہیں ہے۔ آپ کو پریشان کرنا یا تکلیف پہنچانا ہمارا مقصد قطعی نہیں ہے، مگر کیا کریں؟ گھر کا کوئی کام ہوتا، تو آپ سے نہیں کہا جاتا۔ بازار کا کام ہے۔ بازار جائے بغیر کام نہیں چلے گا۔ فی الحال نکڑ والی دُکان سے ایک بلیڈ لا دیجئے۔ پورا پیکٹ میں پھر کبھی منگا لوں گی۔ اِتنی دیر میں چائے ٹھنڈی نہیں ہو جائے گی!! آ کر پی لیجئے گا۔''

پانچ روپئے کا نوٹ میز پر پٹکتے ہوئے چھوٹی بہو نے یہ بھی جتا دیا کہ جانے کو

تو راجیش بھی چلے جاتے، لیکن، اگر یہ مارکیٹ گئے، تو انہیں آفس کے لئے دیر ہو جائے گی ۔ دفتر میں دیر سے پہنچنے کا مطلب باس کے ساتھ جھک جھک ۔اور پھر پورے دِن موڈ خراب۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ شیو کرنے اور پھر نہانے میں بھی کافی ٹائم لگ جاتا ہے۔ دوسرے یہ اُبھی اخبار بھی دیکھ رہے ہیں۔

ماسٹر صاحب کچھ نہیں بولے۔ چُپ چاپ ششما کے لیکچر کو سنتے رہے۔ خاموش رہنے کے علاوہ اُن کے پاس کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اُنہوں نے ہاتھ میں پکڑا چائے کا پیالہ میز پر رکھ دِیا اور صوفے سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

رٹائرمنٹ کے بعد کا ایک برس اہلِ خانہ کے ساتھ انتہائی پیار محبت اور سکون کے ساتھ گزر گیا تھا۔ ماسٹرنی ہر طرح سے اپنے شوہر کا خیال رکھتی تھیں، لیکن تقدیر میں کچھ اور لکھا تھا۔ وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بہار کا موسم جلدی ہی خزاں میں تبدیل ہو جائے گا۔ ایک دِن ماسٹرنی چھت پر سوکھنے کے لئے ڈالے گئے کپڑے اُتار کر نیچے لا رہی تھیں ۔ زینے سے اُترتے وقت پیڑی سے پیر پھسل گیا اور وہ نیچے گر گئیں۔ کئی پیڑیاں پھسل کر فرش پر آنے سے سر میں گہری چوٹیں آئیں۔ اُنہیں علاج کے لئے اسپتال لے جایا گیا۔ تین دِن تک موت اور زندگی کے بیچ چلی زور آزمائش میں آخر کار زیست کو موت کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

بیوی کے انتقال کے بعد ماسٹر جی اکیلے رہ گئے۔ تنہائی اُنہیں چبھنے لگی۔ بدن بیمار اور روز بروز کمزور ہوتا گیا۔ صحت خراب رہنے کے باوجود وہ بہوؤں کے ہاتھوں کی کٹھ پُتلی بن کر رہ گئے۔

سیما اور ششما کا کام اُن پر حکم چلانا اور ماسٹر صاحب کا فرض اُنہیں بے چوں چرا مان لینا بھر رہ گیا تھا۔ بڑے بیٹے راکیش کی طرح چھوٹا بیٹا راجیش بھی اپنی بیوی کا غلام بن گیا۔ دونوں بیٹوں کے نالائق نکل جانے سے ماسٹر جی ذہنی طور پر بھی لاغر ہو گئے تھے۔ دِل ہی دِل میں کُڑھنا اور زبان سے اُف نہ کہنا اُن کی زندگی کا حصّہ بن گیا تھا۔

ماسٹر صاحب چائے کی جگہ خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ کسی طرح صوفے سے اُٹھے اور نہایت خاموشی کے ساتھ پھر بازار کے لئے چل دِئے۔ کسی کو اِس بات کا احساس تک نہیں تھا کہ عمر کی آخری دہلیز پر قبر میں پیر لٹکائے بیٹھے اِس بوڑھے کو کچھ آرام کی بھی ضرورت ہے یا نہیں۔ بیڈمنٹن کی شٹل کاک کی طرح گھر سے بازار اور بازار سے گھر تک دھکیلا جا رہا یہ بوڑھا چند منٹ سکون سے بیٹھ کر اگر چائے کے دو چار گھونٹ پی لیتا، تو اِس میں صدیاں نہیں گذر جاتیں۔

ماسٹر صاحب دروازے سے نکل کر سڑک پر آئے ہی تھے کہ پیچھے سے آئی چھوٹی بہو نے اُنہیں آواز دے کر اپنے پاس بُلایا۔ ششما نے اپنے سسر سے پانچ روپے لے کر پچاس روپے کا نوٹ اُن کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بلیڈ کے علاوہ تازہ ڈبل روٹی بھی لیتے آنے کی فرمائش کی، تاکہ راجیش کو ناشتے میں انڈا فرائی کے ساتھ بریڈ پکوڑے بھی پَروسے جا سکیں۔

ماسٹر صاحب ٹھٹکے، اُنہوں نے چھوٹی بہو کے منہ سے نکلنے والے ایک ایک لفظ کو بڑے غور سے سُنا اور بغیر کچھ کہے نہایت خاموشی کے ساتھ بازار کے لئے چل دئے۔ نکڑ والی دُکان پر بھیڑ کچھ زیادہ تھی۔ محلّے کے لوگ اپنی اپنی ضرورت کا سامان خرید رہے تھے۔ ماسٹر جی کو بلیڈ اور بریڈ خرید کر واپس آنے میں کچھ وقت لگ گیا۔

ششما نے سسر کے دیر سے لوٹنے پر زبان سے تو کچھ نہیں کہا، لیکن اُس کے چہرے پر ناگواری کی نمایاں عبارت کو وہ آسانی سے پڑھ سکتے تھے۔ اُنہوں نے چھوٹی بہو کو دیر سے آنے کا سبب بتانے کی کوشش کی، لیکن اِس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

ماسٹر صاحب گھر سے تین بار بازار جانے اور واپس آنے میں کافی تھک گئے تھے۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئے اور جلدی سے میز پر رکھا چائے کا کپ ہاتھ میں اُٹھایا۔ اُنہیں معلوم تھا کہ چائے کا مزہ خراب ہو چکا ہے۔ اَب وہ جو چائے نوش فرمانے والے ہیں، وہ ٹھنڈے شربت سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

ماسٹر صاحب کو یہ بات کافی ناگوار لگی کہ ششما نے دوسری چائے بنا کر لانے

کی زحمت تو دُور، میز پر رکھی ٹھنڈی چائے کو گرم کر کے لانا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ باوجود اِس کے ان میں کچھ کہنے یا احتجاج کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ بیچارے ماسٹر صاحب کے سامنے پانی بن گئی چائے کو حلق سے نیچے اُتار لینے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا۔

اپنے گھر میں بھیگی بلی بن کر رہ جانے والے یہ وہی ماسٹر صاحب ہیں، جو اِسکولی دِنوں میں طلباء کو تعلیم دیتے وقت کبھی خاموش رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بحث و مباحثہ میں اُن کی خاصی دلچسپی تھی۔ اِس بات کا اندازہ اِسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو بحث و مباحثوں کی تقریب اور مقابلوں میں شامل کرانے کے لئے اُن کی خوب حوصلہ افضائی کیا کرتے تھے۔ اُنہیں روزانہ گھنٹوں ریاض کراتے اور بڑے انہماک سے اپنے ساتھ علاقائی اور ضلع سطح کے مقابلوں میں حصّہ لینے کے لئے لے جایا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بعد میں اُن کے کئی شاگرد بہترین مقرر کے طور پر جانے گئے اور کئی ایک نے سیاست کے میدان میں بھی اپنی الگ پہچان بنائی۔

کئی برس پہلے رٹائر ہوئے ماسٹر صاحب کے گھر میں یوں تو راکیش اور راجیش بیٹے، اُن کی بیویاں سیما اور شُشما، پوتا انکت اور پوتی انکتا تھے، لیکن اِن سب کے باوجود وہ خود کو گھر میں تنہا اور اجنبی سا محسوس کرتے تھے۔ بیوی کے انتقال کے بعد وہ بُری طرح ٹوٹ سے گئے تھے۔ اپنی زبان کا بھرپور استعمال کرنے والے ماسٹر جی کی اپنے ہی گھر میں بولتی بند ہوگئی تھی۔ وقت کے ہاتھوں مجبور بزرگ نے ایک طرح کا سمجھوتہ کر اپنوں کے بیچ خاموش رہنا سیکھ لیا تھا۔

ماسٹر صاحب کا خیال تھا کہ بیوی کے گذر جانے کے باوجود سات افراد پر مشتمل خاندان میں اُنہیں اکیلے پن کا احساس نہیں ہوگا۔ گھر کے چھوٹے موٹے کام خوشی سے انجام دینے کے علاوہ اُن کا زیادہ تر وقت انکت اور انکتا کو پڑھانے لکھانے اور اُن کا ہوم ورک کرانے میں گذر جایا کرے گا، مگر حالات نے اِس کی نوبت نہیں آنے دی۔

راکیش کا لڑکا انکت سیکنڈ کلاس اور راجیش کی لڑکی انکیتا فرسٹ کلاس میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ عادت سے مجبور ماسٹر صاحب نے شروع میں کئی بار بچوں کو اپنے پاس بُلا کر پڑھانے کی کوشش کی، لیکن سیما اور ششما نے اُنہیں یہ کہہ کر منع کر دیا، کہ بچے انگلش میڈیم اسکول کے اسٹوڈنٹ ہیں۔ اُن سے بچوں کا ہوم ورک اور اگلے روز کا کلاس میں ہونے والے ایڈوانس ورک رِوائز نہیں کرایا جا سکے گا۔ دوسرے یہ بھی کہ جب بچوں کو پڑھانے کے لئے ٹیوٹر کو گھر آنا ہی ہے، تو اُنہیں بچوں کی طرف سے کسی طرح کی فکر کرنے یا اُن کی پڑھائی کو لے کر ٹینشن لینے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔

دونوں بہوؤں نے اپنے شوہروں کے ساتھ مشورہ کر بڑی ہوشیاری سے اتنا ضرور کر لیا تھا کہ دونوں بچوں کی ماہواری فیس کے علاوہ اُن کے ٹیوشن پر ہونے والے اِخراجات کی ذمّہ داری بھی اُن کے دادا کے اوپر ڈال دی تھی۔ ماسٹر صاحب کئی برس سے اِس ذمّہ داری کو اپنی پنشن سے خوشی خوشی پورا کرتے چلے آ رہے تھے۔

ماسٹر صاحب جہاں اِس بات سے خوش اور پُر سکون تھے کہ اُن کے دونوں بیٹے اپنی ازدواجی زندگی میں مست، مطمئن اور آرام سے ہیں، وہیں قلب کے ایک گوشہ میں یہ ٹیس بھی تھی کہ ان کے جگر گوشوں کے پاس اَپنے رٹائر اور بوڑھے باپ کے پاس حاضر ہوکر اُن کی خیریت معلوم کرنے یا صحت کے بارے میں جانکاری کرنے تک کا وقت نہیں تھا۔ پیرانہ سالی میں پوتے پوتی کے ساتھ ہنسنے کھیلنے کا خواب دیکھنے والے ماسٹر صاحب اِس بات کو لے کر بھی خاصے غمزدہ تھے کہ انگلش میڈیم اسکول میں تعلیم حاصل کرنے والے پوتا پوتی بھی اُن کی پرچھائی کم ہی دباتے ہیں۔

سکون دینے والی بات تھی، تو بس اتنی کہ اسکول کی ماہانہ اور ٹیوشن فیس کی مقررہ تاریخ دونوں بچوں کو بہر حال ضرور یاد رہتی تھی۔ اگر بچے کبھی اِسے بھول جاتے، تو اُن کی مائیں اُنہیں اِس کی یاد دلا کر خود ہی دادا جی کے پاس بھیج دیتی تھیں۔ اِس کے علاوہ جب کبھی بچوں کو فاضل جیب خرچ کی ضرورت پڑتی، تو اُن کی اپنے دادا جی سے بھاگم بھاگ ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔

جب پوتا اور پوتی ماسٹر صاحب کے پاس آتے، تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ جیب سے روپے نکال کر دینے میں جان بوجھ کر تھوڑی دیر کرتے، تاکہ بچے اپنا کچھ وقت اُن کے پاس گزار سکیں۔ اِس دوران وہ موقع بموقع بچوں سے کچھ ہنس بول کر اپنے دِل کو تھوڑی تسکین دے لیتے تھے۔

ایک دن ماسٹر صاحب کو یہ جان کر کافی تکلیف پہنچی، کہ اُن کی تعلیم یافتہ جدت پسند بہوؤں نے اپنے بچوں کو دادا کے پاس زیادہ نہیں جانے کی اس لئے ہدایت دے رکھی ہے کہ زندگی کے آخری مراحل سے گزر رہے، ٹوٹی صحت کے کمزور بزرگ کو کئی طرح کے چھوٹے موٹے امراض کا سامنا ہے۔ اُن کی کوئی بیماری بچوں کو نہ لگ جائے۔

ماسٹر صاحب ابھی بھی خود کو گھر کا بڑا اور ذمّہ دار سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ اُن کے فہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ جس کنبہ کو منصوبہ بند رکھ کر اُنہوں نے اُسے نہ صرف ایک آئیڈیل خاندان بنانے میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں برتی اور اپنی و اپنی بیوی کی تمام تر خواہشوں کو پسِ پُشت ڈال کر اہلِ خانہ کی بہتری اور خوشحالی کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کر دی، اُسی خاندان کے افراد بُڑھاپے میں اُسے آہستہ آہستہ مرکز سے دُور کرتے ہوئے حاشیہ پر لا ڈالیں گے۔

ماسٹر صاحب کی گاؤں کے اسکول میں جب نوکری لگی تھی، تب دیگر اساتذہ تو قریب قریب ہم عمر تھے، لیکن اُن میں ایک ٹیچر بزرگ سے تھے۔ احتراماً سب اُنہیں بڑے ماسٹر صاحب کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اسکول کے قیام وتعمیر میں اُن کا اہم کردار تھا۔ وہ خود اینٹ، سمنٹ، ریت، بجری، لوہا اور ضرورت کے مطابق لکڑی وغیرہ تک خود لے آنے میں کسی طرح کی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ گھنٹوں گھنٹوں دھوپ میں کھڑے رہ کر تعمیری کام کا جائزہ لیتے اور راجگیر وں کو اپنے مشوروں سے بھی نوازتے تھے۔ اُن کی تعلیمی لگن کا اندازہ اِسی سے ہو جاتا ہے کہ کئی بار وہ اپنی سائیکل کے کیریئر سے چھت کی کڑی باندھ کر اُسے گھسیٹتے ہوئے اسکول تک لائے تھے۔

بڑے ماسٹر صاحب ادارے کے سچے ہمدرد ہونے کے علاوہ پڑھانے کے بھی بڑے شوقین تھے۔ اکثر چھٹی کے بعد بھی طلباء کو پڑھایا کرتے تھے۔ وہ ہر ممکن بچت کرنے میں یقین رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ کلاس میں بلیک بورڈ کے آس پاس فرش پر پڑے چاک کے ٹکڑوں کو اُٹھا کر الماری میں لا رکھتے تھے۔ زمین پر پڑی آلپن تک اُٹھا لیتے تھے۔ کئی اساتذہ کو بڑے ماسٹر جی کا یہ کنجوسی والا رویہ قطعی پسند نہیں تھا۔ وہ اِسے ٹیچر کے اسٹینڈرڈ سے کمتر مانتے تھے۔

ایک دن ایک نوجوان ماسٹر صاحب سے نہیں رہا گیا۔ بڑے ماسٹر صاحب کی کنجوسی پر اُس کا صبر جواب دے گیا۔ اُس نے سوال کر ہی ڈالا، ''گرو جی!! مسلم اسکول کالجوں کے پیشاب گھروں میں چاک کے ٹکڑے نہیں، بلکہ درجنوں سالم چاک پڑی رہتی ہیں۔ آپ کلاس میں گرے پڑے معمولی ٹکڑے اُٹھا کر اُنہیں اسٹاف روم میں لا کر رکھ دیتے ہیں۔ اِس سے کیا کچھ حاصل ہونے والا ہے؟ اس طرح سے آخر کتنی بچت ہو سکے گی اور اسکول کے لئے کتنی رقم جوڑی جا سکے گی؟''

بڑے ماسٹر صاحب نے گہرا سانس لیا اور چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے جواب دیا۔ ''آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ چاک کا چھوٹا ٹکڑا اور معمولی آلپن بھی ہمارے دیش کا اثاثہ اور امانت ہیں۔ کل تک یہ معمولی چیزیں بھی جاپان، جرمن اور برطانیہ جیسے غیر ممالک سے منگانی پڑتی تھیں۔ آسمان والے کا شکر ادا کیجئے۔ اُس نے ہمیں خود کفیل بنا دیا ہے۔ چھوٹی بڑی تمام طرح کی چیزیں ہندوستان میں بنائی جا رہی ہیں۔ ہمیں اِن کی قدر کرنی چاہئے۔ رہی بات بلیک بورڈ پر استعمال ہو سکنے والے چاک کے چھوٹے ٹکڑے یا کاغذوں میں لگائی جانے والی معمولی آلپن کی، تو اِن کی قیمت کا اندازہ تب ہی ہو سکتا ہے، جب ضرورت پڑنے پر یہ دستیاب نہ ہوں۔ یوں بھی اِنہیں ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ اِن کا استعمال کر لیا جائے۔''

بڑے ماسٹر صاحب کی اِس صاف گوئی پر دو تین اساتذہ کو چھوڑ کر تقریباً سبھی ٹیچروں کا رویہ منفی رہا تھا۔ لیکن کتنا صحیح کہا تھا اُنہوں نے!! چاک کے چھوٹے ٹکڑے

تختہ سیاہ پر گھسنے کے لئے ہی تو ہیں۔ ڈِبّہ میں رکھی سالم چاک کے مقابلے چھوٹے ٹکڑے بڑی بے رحمی کے ساتھ آج بھی گھسے جا رہے ہیں۔ زنگ آلود آلپن کو بھی کہاں بخشا جا رہا ہے؟

کبھی کبھی ماسٹر صاحب کو لگتا کہ انسان کی زندگی سالم چاک کی طرح اور اُس کا بڑھاپا چاک کے مختصر سے ٹکڑے کی مانند ہے۔ خاندان میں خود اُن کی حیثیت چاک کے بیکار اور بوسیدہ ٹکڑے سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔ چاک کا ایسا ٹکڑا، جو بلیک بورڈ پر لکھتے وقت ٹیچر کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر گیا ہو۔ جس کی قسمت میں بغیر کسی رو رعایت کے جوتے کے تلے آکر مسلے جانا یا کچھ رعایت کے ساتھ اُٹھا کر پھر سے گھسا جانا لکھا ہے۔ زندگی کے آخری پڑاؤ کی چند گھڑیاں اہلِ خانہ پر بوجھ بن گئی ہیں۔ بوجھ سے خلاصی پانے کے لئے گھِسائی کا عمل ضروری ہے۔ شاید اِسی لئے اُنہیں گھسنے کے بہانے ڈھونڈے جاتے ہیں۔ زندگی کی سفید چاک کے اِس بچے بوسیدہ ٹکڑے کا وجود کس پل ختم ہو جائے، کون جانے؟

○○
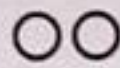
(جنوری ۲۰۱۶ء)

پیٹھ پر سوتیلا بوجھ

گاؤں میں دقیانوسی ذہن کے افراد کی کمی نہیں تھی۔ جاڑا یا بخار ہونے پر لوگ نمازیوں سے پانی پر دَم کرا کر مریض کو پلا دیتے تھے یا پھر مسجد کے مولوی صاحب سے تعویذ، گنڈا بنوا کر اُسے بازو پر باندھ دیتے تھے۔ بدنظر سے حفاظت یا کسی دیگر مرض کے لئے تعویذ کو موٹے دھاگے میں سِل کر گلے میں ڈال دیا جاتا تھا۔ بیمار ہونے والوں اور خاص کر بچوں کے لئے اُن کا یہی عقیدہ تھا۔ اِسی عقیدے سے بچے دیر سویر ٹھیک ہو جاتے تھے۔ گاؤں والوں کا یہ عقیدہ اُنہیں حکیم یا ڈاکٹر کی دہلیز تک جانے سے روکے رکھتا تھا۔ جس گھر میں کسی کو بخار آجاتا، اُس گھر کا کوئی فرد اپنے ہاتھوں میں پانی کا گلاس یا کٹورا لے کر نماز کے وقت مسجد کے دروازے میں جا کر کھڑا ہو جاتا۔ نماز پڑھ کر مسجد سے باہر آنے والے نمازی پانی پر دَم کر دیتے تھے۔ ہاتھ میں پانی لئے شخص دوسرے ہاتھ سے پانی کو ڈھکے رکھتا۔ جب کوئی نمازی پانی پر پھونک مارتا، تو وہ ہاتھ ہٹا لیتا اور دَم کرنے کے بعد اُسے فوراً ڈھک لیتا تھا۔ ہندو حضرات بھی اسی عقیدے کے تحت اپنے بیمار بچوں کو نمازیوں کے ذریعہ دَم کیا ہوا پانی پلاتے تھے۔

اگر ایک دو روز میں افاقہ نہیں ہوتا، تو پھر مولوی صاحب کی خدمات لی جاتیں۔ مولوی صاحب مرض کی نوعیت کے مطابق تعویذ لکھ دیتے یا پھر ضرورت پڑنے پر گنڈا بنا کر دے دیتے تھے۔ بچوں میں چیچک نکل آنے کے زمانے میں نیلے رنگ کے گانٹھ لگے گنڈے بچوں کو خوب پہنائے گئے تھے۔ مولوی صاحب تعویذ یا گنڈا بنانے کی

کوئی اُجرت نہیں لیتے تھے۔تعویذ دیتے وقت یہ بات خاص طور پر سمجھائی جاتی تھی کہ تعویذ پر سات مرتبہ جوتا مار کر اُسے داہنے پیر کے انگوٹھے میں باندھیں۔اگر بخار نہ اُترے تو دوسرے دِن تعویذ پر پھر سات بار جوتا مار کر اُسے بائیں پیر کے انگوٹھے میں باندھ دیں۔مریض کے ٹھیک ہونے تک یہی سلسلہ چلتا تھا۔بچہ پیدا ہونے کے وقت بھی حاملہ کو شہر کے اسپتال لے جانے کا رواج نہیں تھا۔گاؤں کی دائی ہی بچے جنانے کا کام کرتی تھی۔صائمہ کے بچے کی پیدائش بھی گاؤں میں ہی ہوئی تھی، لیکن بچہ پیدا ہونے کے بعد سے صائمہ کی صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ دانش کی پیدائش کے وقت اُسے اسپتال نہیں لے جایا گیا تھا۔ گھر پر ہی بچہ جنا گیا تھا۔اسپتال میں ہی معلوم ہوا کہ صاف صفائی اور احتیاط نہیں رکھنے کی وجہ سے بدن میں انفکشن ہو گیا ہے۔شروع میں دم کیے گئے پانی،تعویذ اور گنڈوں کے علاوہ گاؤں میں موجود پُرانے لوگوں اور نیم حکیموں کے تجربے آزمائے گئے۔مرض کے ٹھیک نہیں ہونے کی صورت میں صائمہ کو شہر کے اسپتال لے جایا گیا۔وہ جب تک اسپتال پہنچی، تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ اسپتال میں قابل ڈاکٹر کے علاج کے باوجود صائمہ جانبر نہ ہو سکی اور ایک دِن موت کے سخت جان پنجوں نے اُسے اپنے آغوش میں لے لیا۔مرتے وقت دانش اُس کے بیڈ پر برابری میں لیٹا تھا۔صائمہ نے بیٹے کو اپنے اوپر لٹا لیا اور اُسے بار بار چومنے لگی۔شاید اُسے یہ احساس ہو چلا تھا کہ اَب وہ زیادہ دیر کی مہمان نہیں ہے۔ اُس کی آنکھوں میں امید و یاس کی جنگ جاری تھی۔ وہ کبھی ساحل کی طرف التفات بھری نظروں سے دیکھتی اور کبھی بیٹے دانش کو نہارتے ہوئے سینے سے چپٹا لیتی۔بستر پر بیٹھا ساحل اُس کی آنکھوں کی زبان سمجھ رہا تھا۔اُس نے صائمہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلّی دی اور بیٹے کو پیار کرتے ہوئے یقین دِلایا کہ وہ دانش کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھے گا۔اُسے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دے گا۔اس کی اچھی پرورش اور بہتر تربیت کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں آنے دے گا۔آخر کار صائمہ نے آنکھیں موند لیں۔ پھر کبھی نہ کھولنے کے لئے۔

صائمہ کے انتقال کے وقت دانش کی عمر صرف تین مہینے تھی۔ اَب دانش کی دیکھ بھال کی ساری ذمّہ داری ساحل پر آگئی تھی۔ وہ روزانہ گاؤں کے پنڈت جی کے یہاں سے گائے کا دودھ لے کر آتا۔ خود دودھ گرم کرتا، پھر اُسے بچے کے پینے لائق ٹھنڈا کر کانچ کی بوتل میں بھرتا اور نپل لگا کر دانش کو پلانے بیٹھ جاتا۔ دودھ پلانے سے پہلے وہ صاف صفائی کا بھی خاص خیال رکھتا تھا۔ اسپتال کی نرس کے ذریعہ معصوم کی پرورش کے بتائے گئے طریقے اپنانے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا۔ ایک برتن میں پانی لیتا، اُسے چولہے پر رکھتا اور پھر اُس میں کانچ کی بوتل اور نپل ڈال کر کافی دیر تک اُبالتا رہتا۔ پھر بوتل میں نہ زیادہ گرم اور نہ زیادہ ٹھنڈا دودھ بھرتا اور دانش کو گود میں لٹا کر اپنے ہاتھ سے اُسے دودھ پلاتا۔ حالانکہ گھر میں ماں کے علاوہ بہن بھی تھی، لیکن ساحل اِس بہانے بیٹے کے پاس زیادہ سے زیادہ وقت گذارتا تھا۔ چھ مہینے گذر گئے۔ صائمہ کا ساتھ زیادہ نہیں رہنے کا ملال گھر والوں کے علاوہ ساحل کو بھی ہر وقت ستاتا رہتا۔ ساحل زیادہ تر خاموش ہی رہتا۔ اہلِ خانہ اور عزیز و اقارب ساحل کی خاموشی کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اُس کی پریشانی سے اچھی طرح واقف تھے۔ سبھی چاہتے تھے کہ ساحل نکاح کر لے اور دانش کے لئے دوسری ماں لے آئے۔ ساحل کے سامنے پوری زندگی پڑی تھی۔ یوں بھی زندگی کا لمبا سفر اکیلے طے ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔ عزیز و اقرباء کے اصرار پر ساحل نے کئی بار دوسرے نکاح کے بارے میں سوچا، لیکن گھر میں آنے والی نئی عورت کے دانش کے ساتھ سوتیلے برتاؤ اور بُرے رویہ کے ذہن میں آتے تصور سے کانپ جاتا۔ سوتیلی ماں یا سوتیلے باپ کے اولاد کے ساتھ برتاؤ کو سماج نے کبھی مانا نہیں دی۔ عام لوگوں کی رائے تھی کہ سو میں ایک دو ہی معاملے ایسے ہوتے ہیں، جن میں سوتیلے پن کی کڑواہٹ نہیں ہوتی۔ حالانکہ کئی مائیں سوتیلی اولاد کو سگی ماں جیسا ہی پیار و دلار دیتی ہیں اور اِسی طرح کئی باپ سوتیلی و حقیقی اولاد میں فرق نہیں کر اُنہیں واجب محبت سے نوازتے ہیں، لیکن اِس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایسے معاملات بہت کم اور اُنگلیوں پر گنے جانے والے ہی

ہوتے ہیں۔ زیادہ تر معاملات میں نفرت اور تفاوت کی بے شمار مثالیں آس پاس ہی نظر آجاتی ہیں۔ گھر والوں کے سمجھانے سے آخر کار ساحل نے دانش کی مناسب پرورش کے مدِ نظر ناظمہ نام کی ایک لڑکی سے نکاح کر لیا۔ ناظمہ نے دانش کو ماں کا پیار دیا۔ اُس نے سوتیلے بیٹے کی پوری ذمّہ داری ہی نہیں اُٹھائی ، بلکہ اپنی خدمات اور حسن وسلوک سے اہلِ خانہ کو متحیر کر دیا۔ بہت کم وقت میں وہ سب کی پیاری ہو گئی۔ ساحل کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ ماں، بہن اور باپ بھی ہر طرح خوش اور مطمئن تھے۔ ابھی اُن کے نکاح کو ایک برس ہی ہوا تھا کہ گھر میں ایک اور بچے کی کلکاریاں گونج اُٹھیں۔ ماں کی برابر میں لیٹے چھوٹے سے منے کو دیکھ کر دانش بہت خوش تھا۔ ڈیڑھ سال کے دانش کو گھر میں کھلونا مل گیا تھا۔ وہ ہر وقت منے کے پاس لگا رہتا۔ اُسے پیار کرتا اور اپنی توتلی زبان سے مُنا مُنا پکارتا رہتا۔ ساحل کو شہر میں چھوٹی سی نوکری مل گئی تھی۔ وہ روزانہ دفتر جاتا اور کلرکوں کے کام میں اُن کی مدد کرتا۔ ناظمہ خوشی خوشی بچوں کی دیکھ بھال کرتی اور گھر کے تمام کام انجام دیتی۔ ایک طرح سے گھر کے کونے کونے میں خوشیوں کا بسیرا تھا۔

دانش چار اور ثاقب ڈھائی برس کا ہو چکا تھا۔ ثاقب کا داخلہ گاؤں کے اسکول میں کرا دیا گیا تھا۔ ناظمہ خود اُسے اسکول چھوڑنے جاتی اور چھٹی ہونے پر اسکول سے گھر لے کر آتی تھی۔ محلے کی عورتیں اُسے طعن بھی کرتیں کہ سوتیلے بیٹے کو کیسے اُٹھائے پھرتی ہے، لیکن اُسے کسی کی پرواہ نہیں تھی۔

کلوتائی محلّہ کی عمر رسیدہ عورت تھی۔ وہ ناظمہ کے ساتھ جب کبھی دانش کو دیکھتی، منہ بسورنے لگتی اور کچھ نہ کچھ جلا کٹا کہہ کر ہی اپنے راستے آگے بڑھتی تھی۔ گاؤں میں وہی ایک عورت ایسی تھی، جو موقع بموقع ناظمہ کے کان سب سے زیادہ بھرا کرتی تھی۔ وہ ناظمہ کو لگاتار یہ سمجھانے کی کوشش کرتی تھی کہ اُس کے دونوں بیٹوں کے بیچ کافی فرق ہے اور یہ فرق وہ نہیں کر رہی ہے، بلکہ یہ فرق تو قدرت کا ہی کیا ہوا ہے۔ دانش سوتیلا ہے، ساحل کی پہلی بیوی کا بیٹا۔ دانش کسی بھی صورت میں اُس کے

بیٹے کی برابری نہیں کر سکتا۔ ثاقب تو ویسے بھی صحت میں کمزور سا ہے، اسے بہتر دیکھ بھال اور عمدہ غذا کی ضرورت ہے۔ بالائی کے دودھ کا اس کا حق بنتا ہے۔ سوتیلا فربہ ہے اِسے تو پانی ملا دودھ بھی چل جائے گا۔ سوتیلی اولاد پر کتنا ہی پیار لٹایا جائے، کتنا ہی بہتر کھانے پینے کو دیا جائے اور کتنی ہی اچھی پرورش کی جائے، لیکن سماج اسے قبول نہیں کرتا۔ عورت پر ہمیشہ سے سوتیلے پن کا الزام لگتا آیا ہے۔ کلوتائی کا یہ بھی کہنا تھا کہ اگر وہ دانش کو اپنا خون بھی پلادے گی، تو بھی کوئی ماننے والا نہیں ہے۔ سب یہی کہیں گے کہ سوتیلی ماں کا رویہ ساحل کی پہلی بیوی کے بیٹے کے ساتھ اچھا ہو ہی نہیں سکتا!!

دانش کو ماں سے بہت محبت تھی۔ وہ اکثر اُسے چپٹا رہتا تھا۔ خاص کر اُس وقت جب ماں ثاقب کو کچھ کھلا پلا رہی ہوتی تھی۔ ایسے میں دانش پیچھے جاکر ماں کی گردن میں باہیں ڈال دیتا اور پیٹھ پر چڑھ جاتا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ پیچھے موڑتی اور کمر پر بیٹھے دانش کو بھی وہی سب کچھ کھلاتی جو ثاقب کو کھانے کو دیتی تھی۔ ناظمہ کو اُس کی یہ حرکت کیسی لگتی، اُس نے اِس کا کبھی اظہار نہیں کیا۔ لیکن فرطِ محبت میں وہ آگے پیچھے ہل کر دانش کو جھولا بھی جُھلاتی تھی۔ یہ روز کا معمول تھا۔ اگر وہ کبھی کمر کو جھٹک کر دانش کو پیچھے گرا دیتی، تو وہ پھر سے کمر پر آپڑتا تھا۔ ماں کے گلے میں اپنے دونوں بازو ڈالتا اور پیروں کو اُوپر اُٹھالیتا تھا۔ ایسا کرنے پر کئی بار ناظمہ کا گلا گھٹنے لگتا، لیکن وہ اُسے ڈانٹتی پھٹکارتی نہیں تھی۔ بڑے بھائی کو دیکھ کر ثاقب بھی ماں کے پاس آجاتا اور وہ بھی گلے میں اپنی باہیں ڈال دیتا۔ دونوں بیٹوں کے معصوم بدن کا لمس ناظمہ کو بہت اچھا لگتا اور وہ ایک طرح سے اس کی عادی سی ہوگئی تھی۔

ناظمہ کی ماں فرسودہ روایات اور پُرانے خیالوں کی گھاگ عورت تھی۔ وہ جب بھی ناظمہ سے ملنے آتی، اُسے سگے سوتیلے کے فرق سے ضرور آگاہ کرتی۔ اُس کا بھی دوٹوک یہی کہنا تھا کہ سگا سگا ہوتا ہے اور سوتیلا سوتیلا۔ یہ فرق ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ کوئی عورت سوتیلے بیٹے پر چاہے حقیقی ماں سے بھی زیادہ لاڈ پیار نچھاور کردے، لیکن سوتیلا پن کبھی اپنا اثر نہیں چھوڑتا۔ اس کا تعلق ماں کے پیٹ سے ہوتا ہے۔ حقیقی اولاد

اپنے بطن سے پیدا ہوتی ہے، جبکہ سوتیلی سنتان دوسری عورت (سوتن) کے پیٹ سے جنم لیتی ہے۔

لگاتار ٹوکا ٹاکی اور حقیقی و غیر حقیقی اولاد کا فرق برابر ذہن نشیں کرانے سے ناظمہ کو لگنے لگا کہ ثاقب کی نانی اور محلے کی عورتیں اُسے جس فرق سے روشناس کراتی رہتی ہیں، اُس میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہوتی ہوگی، ورنہ کوئی بے مطلب ایک ہی بات کو بار بار نہیں دوہراتا۔ یہ سبھی عورتیں عمر میں اُس سے بڑی ہیں۔ شاید وہ یہ سب اپنے تجربے کی بنا پر کہہ رہی ہوں۔ اکثر یہ بات بھی دیکھنے سننے میں آئی ہے کہ ایک جگہ گرنے والی بارش کی بوندیں صحن میں پڑے پتھر پر بھی نشان بنا دیتی ہیں۔ پھر وہ تو نازک سی عورت ہے۔ اِس کا اثر یہ ہوا کہ ناظمہ کے قلب و دماغ میں بھی اپنے اور پرائے کا فتنہ پنپنا شروع ہوگیا۔ حالانکہ دانش، ماں اور اپنے چھوٹے بھائی ثاقب سے بے حد پیار کرتا تھا، لیکن اِس کے باوجود اُسے دانش کے بالمقابل اپنے بیٹے سے زیادہ قربت اور خاص محبت کا احساس ہونے لگا۔ اب جب بھی ناظمہ کی نظر دانش پر پڑتی، اُس کی آنکھوں میں خود بخود سوتیلے پن کا تصور اُبھر آتا۔

ایک دِن ناظمہ دونوں بیٹوں کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلا رہی تھی۔ تبھی کہیں سے گھومتی گھامتی کلوتائی گھر میں داخل ہوئی۔ وہ ناظمہ کے دانش اور ثاقب کو کھانا کھلانے کے محبت بھرے مادرانہ عمل کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ چونکنے کا سبب یہ تھا کہ اُس کا اپنا بیٹا ثاقب تو سامنے فرش پر بیٹھا تھا، جبکہ سوتیلا بیٹا دانش اُس کی کمر پر چڑھا ہوا تھا۔ اتنا ہی نہیں ناظمہ اپنی پیٹھ پر یہ بوجھ خوشی سے برداشت کر رہی تھی۔ دونوں بچوں کو اپنے ہاتھ سے روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ایک ہی پیالی میں رکھے دودھ میں بھگو بھگو کر کھلا رہی تھی۔ وہ روٹی کا ایک ٹکڑا اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ثاقب کو کھلاتی، پھر دوسرا ٹکڑا اپنا ہاتھ پیچھے گھما کر کمر پر سوار سوتیلے بیٹے کے منہ میں رکھ دیتی۔ سگے بیٹے کی نسبت سوتیلے بیٹے سے اِس قدر پیار کا فلسفہ کلوتائی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر کار جب اُس سے یہ پہیلی حل نہیں ہوئی، تو اُس نے ناظمہ سے سیدھے سیدھے معلوم کرنا ہی

مناسب سمجھا، ''کیوں ری تو یہ کیا کر رہی ہے؟ نو مہینے پیٹ میں رکھنے، ولادت کے وقت کی سخت تکلیف کو برداشت کرنے اور دو برس تک اپنا دودھ پلانے والے بیٹے کو تو نیچے فرش پر بیٹھا رکھا ہے اور پرائے خون کو اپنی پیٹھ پر چڑھائے بیٹھی ہے؟ لگتا ہے سوتیلے بیٹے نے جادو کر دیا ہے تجھ پر! اِس کی کمائی کھائے گی، تو شاید؟''

کلو تائی کا طنزیہ فقرہ سن کر ناظمہ نے گہری سانس لی۔ اپنے چہرے پر مسکراہٹ لئے جلدی سے بچوں کو کھانا کھلانے کے کام کو انجام دیا اور پھر اُنہیں اندر رکھے کھلونوں سے کھیلنے کے لئے کمرے میں بھیج دیا۔

کلو تائی نے ناظمہ کو غور سے دیکھا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنا سوال دوہرایا، ''تائی جیسا تم نے مجھے سکھایا میں بالکل ویسا ہی تو کر رہی ہوں۔ کافی فرق آ گیا ہے مجھ میں۔ اَب دانش کے لئے میرے دِل میں پہلے جیسی ممتا نہیں رہی۔ دونوں کے بیچ فرق کرنے لگی ہوں میں۔ رشتہ کی گرماہٹ میں کمی آ گئی ہے۔''

''میں نے ایسا کرنے کو کب کہا تھا کہ تو اپنے بیٹے کو تو زمین پر بیٹھائے اور سوتیلے بیٹے کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لادے پھرے! اُسے کھانا بھی اپنی پیٹھ پر بیٹھا کر کھلائے!! وہ بھی اپنے ہی ہاتھ سے!!! میری تعلیم کو تو بالکل اُلٹ کر رکھ دیا ہے تُو نے'' کلو تائی نے کسی طرح اپنی بات پوری کی۔

چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ لئے ناظمہ نے کسی بڑی بوڑھی عورت کے پُختہ انداز میں آنکھیں مٹکائیں اور ہوا میں داہنا ہاتھ نچاتے ہوئے کہا، ''تائی! دانش میرا سوتیلا بیٹا ہے۔ میں اِس کا بوجھ اپنی پیٹھ پر تو برداشت کر سکتی ہوں، لیکن اپنی آنکھوں کے سامنے کی جگہ اِسے کبھی نہیں دے سکتی!!''

○○

(اگست ۲۰۱۶ء)

مُداوا

شہر کی آزاد پور کالونی کئی خوبیوں کے لئے مشہور تھی۔ ملی جلی آبادی کے باوجود یہ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہاں الگ الگ مذہب اور برادری کے لوگ رہتے ہیں۔ سبھی ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں تہ دل سے اِس طرح شریک رہتے تھے، جیسے کہ یہ معاملہ اُن کا اپنا ہو۔ کالونی والے ایک دوسرے کا اتنا لحاظ رکھتے تھے کہ نہ کبھی کسی مالدار شخص کی زبان پر تکبر کا کوئی لفظ مچلتا تھا اور نہ ہی کبھی کسی غریب کے چہرے پر اُس کی بے کسی کا درد جھلکنے کی نوبت آتی تھی۔ ہر ایک مذہب اور فرقہ کے لوگوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے یہ کالونی اپنی گنگا جمنی تہذیب کے لئے بھی پہچانی جاتی تھی۔ کالونی میں قریب ساٹھ فیصد آبادی ہندوؤں کی تھی۔ اِن میں بنئے، جاٹ، چوہان اور کمہار برادری کے افراد شامل تھے۔ تناسب کے اعتبار سے مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں سے کم تھی۔ کچھ گھر سکھوں کے بھی تھے۔

ذات برادری کی نابرابری کے باوجود کالونی میں سب لوگ ایک ساتھ اِس طرح سے گھلے ملے رہتے تھے، جیسا کہ الگ الگ قسم کے پودوں پر رنگ برنگ کے کھلے پھول چمن کو تازہ اور پُر رونق بنائے رکھتے ہیں۔ مختلف مہک رکھنے والے پھولوں کی گلشن میں پھیلی خوشبو کو جس طرح ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے، ٹھیک اُسی طرح کالونی کے لوگ بلا تفریق مذہب و ملت اور ذات پات کے برسوں سے بے حد پیار و محبت سے ایک ساتھ رہتے آئے تھے۔ سب ایک دوسرے کے دُکھ اور

سکھ میں ہی شریک نہیں رہتے تھے، بلکہ ہر ایک مسئلہ کو آپس میں مِل بیٹھ کر بڑی آسانی سے حل کر لینے کا ہنر بھی بخوبی جانتے تھے۔ کالونی کے لوگوں کی ایک صفت یہ بھی تھی کہ کھیل کود میں ملوث بچوں کے درمیان کبھی کبھار ہونے والی تُو تُو، میں میں اور مار پیٹ کو مکمل طور پر نظر انداز کرنے کی بہتر سمجھ کی وجہ سے بڑوں کے درمیان نوبت تکرار تک نہیں پہنچتی تھی۔ غلطی کسی بھی طرف سے ہوتی تھی، ہر ایک شخص اپنے ہی بچے کو ڈانٹ ڈپٹ کر نہ صرف اُسے خاموش کر لیتا تھا، بلکہ تکرار کو ختم کرا کر پھر سے آپس میں ساتھ رہنے اور مل جل کر کھیلنے کے لئے بھی راہ استوار کر دیتا تھا۔

اِسی کالونی میں ڈاکٹر آر کے گویل کا بھی مکان تھا۔ نام روی کمار ہونے کے باوجود وہ خود کو آر کے گویل کہلانا پسند کرتے تھے۔ مکان میں زیادہ جگہ نہیں ہونے کی وجہ سے اُنہوں نے دوسرے محلہ میں اپنا اسپتال کھول لیا تھا۔ ڈاکٹر گویل کا شمار شہر کے دولت مند اشخاص میں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر گویل بذاتِ خود بہت ہی نیک اور شریف انسان تھے۔ معاشرے میں اُن کی شبیہہ چھل فریب سے مستثنیٰ تصور کی جاتی تھی۔ اُن کا کبھی کسی کے ساتھ جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ اسپتال میں داخل ہونے والے مریضوں اور اُن کے ہمراہ آنے والے تیمارداروں کے ساتھ بھی اُن کا رویہ بے حد ایماندارانہ اور بہت حد تک مخلصانہ تھا۔ کالونی کے لوگوں میں بھی وہ باوقار تسلیم کئے جاتے تھے۔

ڈاکٹر گویل نے جب اپنا اسپتال شروع کیا تھا، تب اُس کی افتتاحی تقریب میں جہاں شہر کے مخصوص لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا، وہیں کالونی کے لوگوں کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ سبھی لوگوں نے بڑی خوش دلی کے ساتھ افتتاحی جشن میں شرکت کی تھی۔ اِس موقعہ پر مٹھائی تقسیم کرنے کے علاوہ طعام کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ بہتر سہولتوں اور مناسب اخراجات کے سبب کچھ ہی دِنوں میں اسپتال نے نہ صرف شہر اور علاقہ میں شہرت حاصل کر لی تھی، بلکہ ضلع میں بھی جلدی ہی نام پا لیا تھا۔ دُور دُور سے مریضوں کے آنے کا سلسلہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ اسپتال کی ترقی دیکھ کر کالونی کے لوگ بھی خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ اکثر لوگ اپنے رشتہ داروں اور ملنے والوں کو بڑے

فخر کے ساتھ بتایا کرتے تھے کہ یہ اسپتال اُن کی کالونی میں رہنے والے ڈاکٹر آر کے گویل کا ہے۔

ڈاکٹر گویل کی بیوی ششما گویل بھی ایک قابل ڈاکٹر تھی اور اُنہیں کے ساتھ اسپتال میں کام کرتی تھی۔ خواتین کے پوشیدہ امراض کی اسپیشلسٹ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر زنانہ مریضوں کو وہی دیکھتی تھی۔ گویل فیملی میں صرف دو بچے تھے۔ انکت نام کا بیٹا اور رشمی نام کی بیٹی ۔دونوں نے سائنس بایولاجی کے ساتھ انٹرمیڈیٹ کے امتحانات امتیازی حیثیت سے پاس کر لئے تھے۔ گھر میں روپے پیسوں کی کمی نہیں تھی، اس لئے ڈاکٹر گویل نے مقامی تعلیم حاصل کرانے کے بعد دونوں بچوں کو ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے امریکہ بھیج دیا تھا۔

گھر پر ڈاکٹر گویل اور اُن کی بیوی کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔دونوں کا زیادہ تر وقت اسپتال میں مریضوں کے درمیان گذرتا تھا۔رفتہ رفتہ وقت آگے بڑھتا رہا اور روپے پیسوں کی بارش کے سبب اُن کا اسپتال ہی اُن کی دُنیا بن کر رہ گیا۔شہر کے سیاسی حالات میں مداخلت تو پہلے ہی سے نہیں تھی، اَب سماجی معاملات میں دخل بھی نہیں رہا تھا۔ اتنا ہی نہیں کالونی کے معاملات اور تقریبات میں شامل ہونے کی دلچسپی نہ کے برابر رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنی اَنا کے حصار میں قید ہو کر رہ گئے ہوں۔

حافظ مرتضیٰ حسین محلّہ کی مسجد میں پیش امام کے فرائض پر معمور تھے۔اولاد کے نام پر اُن کے صرف ایک بیٹی تھی۔ ڈھلتی عمر میں بیٹی پیدا ہونے پر اُنہوں نے بڑے پیار سے اُس کا نام تمنا رکھا تھا۔ بیٹی کے عقیقہ میں امام صاحب نے دِل کھول کر خرچ کیا تھا۔ اپنی کالونی کے تمام لوگوں کی دعوت کے علاوہ شہر کے کئی محلوں کے لوگوں کو بھی خوشی کی تقریب بہ سعید میں شامل کیا تھا۔ دینی تعلیم کے ساتھ کچھ عصری علم و ہنر حاصل کر بالغ ہو گئی تمنا کے نکاح کا دن تھا۔ برات اور مہمانوں کی خاطر مدارات کا سلسلہ جاری تھی۔اس مبارک موقع پر سبھی مذاہب کے لوگوں نے ہنسی خوشی بڑھ چڑھ کر حصّہ

لیا،لیکن ڈاکٹر گوئیل اِس مبارک تقریب میں تشریف نہیں لائے۔ خوشی کے لمحات میں ڈاکٹر گوئیل کے شرکت نہیں کر پانے کی شکایت امام صاحب نے تو نہیں کی، لیکن کالونی کے کئی لوگوں کو اُن کی غیر حاضری کچھ اُکھری سی گئی۔ کئی چہروں پر ناگواری کی عبارت بھی بخوبی پڑھی گئی۔ امام صاحب کے کانوں تک جب یہ بات پہنچی، تو اُنہوں نے لوگوں کو سمجھاتے ہوئے کہا،"بغیر حقیقت جانے کسی کے تئیں بدگمانی ٹھیک نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے ڈاکٹر صاحب کسی مریض کے علاج میں مصروف ہوں، ورنہ وہ تمنا بیٹی کے نکاح میں ضرور تشریف لاتے۔" کالونی والے امام صاحب کے جواب سے مطمئن نہیں تھے، لیکن ادب واحترام کی وجہ سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔ آخرکار خاموش ہوگئے۔ کئی لوگوں کے ذہن میں رہ رہ کر یہ سوال بھی گشت کرتا رہا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈاکٹر صاحب مسجد کے امام مرتضیٰ حسین کے مسلمان ہونے کی وجہ سے اُن کی بیٹی کے نکاح میں جان بوجھ کر شریک نہ ہوئے ہوں۔

بات آئی گئی ہوگئی، لیکن کالونی کے لوگوں کا شک اُس دِن اور پختہ ہوگیا، جس دِن بازار سے گھر لوٹتے ہوئے دِلاور حسین کو ایک کار نے کُچل ڈالا۔ دِلاور حسین نے بیچ سڑک پر چل رہی ضعیفہ شانتی دیوی کو بچانے کی کوشش کی۔ دِلاور حسین نے تیز رفتار کار کے سامنے سے ضعیفہ کو تو کھینچ کر بچالیا، لیکن خود کار کی زد میں آگیا۔ اُس کی موقع پر ہی موت ہوگئی۔ دِلاور حسین ایک خوبصورت اور صحت مند نوجوان تھا۔ اُس سے کسی کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اپنا کام دھندا چھوڑ کر دوسروں کی خدمت کرنے میں اُسے بہت سکون ملتا تھا۔ حادثہ کی جانکاری ملتے ہی بڑی تعداد میں کالونی والے نہ صرف موقع واردات پر پہنچے، بلکہ اُس کے گھر کے باہر مجتمع ہوکر اہلِ خانہ سے اظہارِ تعزیت بھی کیا۔ شانتی دیوی کا روتے روتے بُرا حال تھا۔ وہ بس یہی کہے جا رہی تھی کہ دِلاور نے اُسے بچانے کے لئے اپنی جان دے دی۔ بوڑھیا کو بچانے میں جوان بیٹا چلا گیا۔ کاش اُس نے اُسے نہ بچایا ہوتا! دِلاور حسین کے جنازے میں محلّہ کے مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے لوگوں نے بھی خاصی تعداد میں شرکت کی۔ اُس

روز بھی اگر کوئی جنازے کی غم زدہ تقریب سے غیر حاضر تھا، تو وہ ڈاکٹر گویل ہی تھے! لوگوں کو اِس حادثاتی موت کے دفینے میں ڈاکٹر گویل کے شریک نہیں ہونے سے جتنی تکلیف پہنچی، اتنا دُکھ امام مرتضیٰ حسین کی بیٹی کے نکاح سے غیر حاضر رہنے سے بھی نہیں ہوا تھا۔

کئی مہینے بعد شیکھر کے گھر بیٹے کا جنم ہوا۔ شیکھر نے بیٹے کے نام کرن سنسکار کے بہانے اپنی خوشی میں کالونی کے لوگوں کو دعوت نامے دِئے۔ آٹھ برس کی ازدواجی زندگی کے بعد شیکھر کے گھر میں آئے خوشی کے لمحات ساجھا کرنے کے لئے حسبِ معمول ہر مذہب اور فرقہ کے افراد نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، لیکن ڈاکٹر گویل اِس پُر مسرّت تقریب میں بھی شامل نہیں ہوئے۔ اِس سے قبل امام مرتضیٰ حسین کی بیٹی کے نکاح کی خوشی اور دِلاور حسین کی حادثہ میں ہوئی موت کے غم میں شریک نہیں ہونے کے لئے یہ مانا جا رہا تھا کہ ہو سکتا ہے اُن کا نظریہ کٹّر پنتھی ہندوتو وادی کا ہو اور وہ مصلحتاً مسلمانوں سے زیادہ میل جول رکھنے کے خواہاں نہ ہوں، لیکن شیکھر تو اُنہیں کے مذہب اور ذات سے تعلق رکھنے والا شخص ہے۔ پھر کس وجہ سے ڈاکٹر گویل شیکھر کے بیٹے کے جنم کی خوشی میں شریک نہیں ہوئے؟ پیچیدہ قسم کے اِس نازک سوال کا کالونی کے لوگوں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، لیکن ڈاکٹر گویل کے اِس غیر سماجی عمل نے اُنہیں بے حد دُکھی کرنے کے علاوہ سوچنے پر بھی مجبور کر دیا۔

بچہ کے نام کرن سنسکار کے واقعہ کو ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ایک اور سانحہ نے کالونی کے لوگوں کو غمگین کر دیا۔ سوہن دیو محلّہ میں سب سے زیادہ عمر کے شخص تھے۔ پچھلے کافی دِنوں سے علیل چل رہے تھے۔ سوہن دیو کالونی کے اُن گنے چُنے لوگوں میں سے ایک تھے، جو بسترِ علالت پر آنے سے قبل تک لوگوں کے نجی کاج کو اپنا کام سمجھ کر اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں پیش پیش ہو جاتے تھے۔ وہ پوری دِلچسپی کے ساتھ شرکت تو کرتے ہی تھے، اپنے قیمتی مشوروں سے بھی نوازا کرتے تھے۔ لوگوں کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے اور ہر ممکن مدد کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہنے کی وجہ

سے ہر چھوٹے بڑے کے دِل میں سوہن دیو کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ گھر والوں نے اُن کی دوا دارو میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کی۔ بلا تفریق مذہب و ملّت کالونی والے اُن کی عیادت کو آتے اور اُوپر والے سے اُن کے صحت یاب ہونے کی دُعا کرتے، لیکن نہ دوا نے کچھ کام کیا اور نہ ہی دُعا کوئی اثر دِکھا سکی۔ سوہن دیو کی بیماری بجائے گھٹنے کے بڑھتی ہی گئی۔ آخر کار اُن کا انتقال ہو گیا۔

کالونی کے لوگ بہت زیادہ غم زدہ تھے۔ اُس دِن کوئی کام پر نہیں گیا۔ سبھی لوگوں نے اپنے اپنے عقیدے کے مطابق مرحوم کے لئے دُعائے مغفرت کی۔ اُن کے آخری سفر میں دوسرے محلوں کے لوگ بھی شامل ہوئے۔ میّت کی آخری رسم (انتم سنسکار) کے تحت اُن کی چِتا میں آگ لگائی گئی۔ نعش جل کر راکھ ہونے کے عمل سے فراغت پا کر لوگ اپنے گھروں کو واپس آ گئے۔ شام کو مجتمع لوگوں کے بیچ سوہن دیو کی آخری رسومات میں ڈاکٹر گویل کے شریک نہ ہونے کی شکایت غصّہ میں تبدیل ہو گئی۔ لوگوں نے ایسا محسوس کیا جیسے ڈاکٹر گویل کالونی والوں سے لاتعلق ہو گئے ہیں۔ مالداری کے زعم میں اُنہیں بھول گئے ہیں، یا اَب اِتنے بڑے رُتبہ کے شخص ہو گئے ہیں کہ کالونی کے افراد اور برادری والوں کی اُن کے سامنے کوئی وقعت نہیں رہ گئی ہے۔ اُنہیں ڈاکٹر گویل کے سامنے اپنا قد بونا ہوتا نظر آیا!!

ڈاکٹر گویل کے قریبی سمجھے جانے والے نوجوت سنگھ نے اُن کے معاشرے سے لاتعلق ہونے کی سیدھی شکایت کر اُنہیں کالونی والوں کی ناراضگی سے واقف ہی نہیں کرایا، بلکہ اُنہیں اَپنے غیر سماجی رویہ میں فوری طور پر تبدیلی لانے کا قیمتی مشورہ بھی دِیا۔ نوجوت سنگھ کے مشورہ پر ڈاکٹر صاحب کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آ کر رہ گئی۔ زیادہ اصرار کرنے پر بَس اِتنا ہی کہا، ''ارے بھائی نوجوت سنگھ جی! مریضوں سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے!! اِتنے بڑے اسپتال کی ذمہ داری کا معاملہ ہے۔ اِسے کیسے نظر انداز کر دوں؟ ایک آدمی کے نہ پہنچنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ سب لوگ تو کالونی والوں کے سُکھ دُکھ میں شریک رہتے ہی ہیں۔ میں اگر کسی تقریب میں نہیں

بھی جا پاتا تو کیا ہوا، میری دِلی خواہش اور بھاوٗنائیں تو وہاں موجود رہتی ہی ہیں۔‘‘
نوجوت سنگھ کو لگا جیسے ڈاکٹر گویل نے اُن کے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا ہو۔ اُن کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں ہو گئے، لیکن خاموش رہنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اُٹھے اور ڈاکٹر گویل کے روکنے کے باوجود اسپتال سے باہر نکل گئے۔ اِس یقین کے ساتھ کہ اُن کے چہرے کی ناگواری ڈاکٹر گویل کو آئندہ کالونی میں ہونے والی ہر تقریب میں شرکت کرنے کے لئے ضرور بہ ضرور مجبور کر دے گی۔

نوجوت سنگھ کا یہ خیال ایک ہفتہ بعد ہی اُس وقت خام ثابت ہو گیا، جب اُن کی بیوی امرجیت کور کو گھر کی صفائی کرتے وقت بجلی کا کرنٹ لگ گیا اور وہ آناً فاناً میں اِس دُنیا سے رُخصت ہو گئی۔ یہ غم اکیلے نوجوت سنگھ کا نہیں تھا، بلکہ کالونی کے تمام افراد کا دُکھ تھا۔ کالونی کے لوگوں نے حسبِ عادت امرجیت کور کے جنازے اور آخری رسومات میں شرکت کی۔ لوگوں کو یقینِ کامل تھا کہ ڈاکٹر گویل اپنے دوست کی بیوی کے انتقال پرملال کے موقع پر اُنہیں پُرسا دینے ہی نہیں، بلکہ جنازے اور مذہبی رسومات میں بھی ضرور بہ ضرور شرکت کریں گے، لیکن اُن کا یقین اُس وقت مایوسی میں تبدیل ہو گیا، جب ڈاکٹر گویل نوجوت سنگھ کے دُکھ میں بھی شریک نہیں ہوئے۔ اِس واقعہ نے کالونی والوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اُن کے دل میں ڈاکٹر گویل کی طرف سے نفرت اُبھر آئی۔

آخر کار وہ وقت بھی آ گیا، جب لوگوں نے ڈاکٹر گویل کے کسی تقریب میں حاضر ہونے یا اُن کے غیر حاضر رہنے پر تبصرہ کرنے میں اپنا وقت ضائع کرنا ہی بند کر دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کہ برادری اور کالونی کے لوگوں نے زبان سے کچھ کہے بغیر آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی بڑا فیصلہ کر لیا ہو۔ وقت کبھی کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ اُس کا کام ہمیشہ آگے بڑھتے رہنا ہے۔ وہ دیوار پر لگی گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ کالونی کے دیگر افراد کے رویہ میں کسی طرح کی بے رغبتی نہیں آئی۔ سب ایک دوسرے کی خوشی، غم اور رائے مشوروں میں برابر شریک ہوتے رہے۔

ڈاکٹر گویل کا بیٹا انکت اور بیٹی رشمی ڈاکٹری کی ڈگری اور ایم ڈی کا خصوصی ڈپلومہ حاصل کرنے کے بعد دو ہفتہ قبل ہی گھر لوٹے تھے۔ گویل خاندان میں خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ لیکن قدرت کے کھیل بھی نرالے ہوتے ہیں۔ کب کیا ہو جائے، کچھ کہا نہیں جا سکتا؟ اِسے آسمانی عتاب کہا جائے یا کالونی والوں کی بد دُعاؤں کا اثر!! امر جیت کور کی موت کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ ڈاکٹر گویل کے اسپتال میں ہی حادثہ ہو گیا۔ مریضوں سے فارغ ہو کر شام کے وقت ڈاکٹر سیما گویل ٹہلتے ہوئے تیسری منزل کی بالکنی میں چلی گئی۔ وہ ریلنگ کے سہارے کھڑی ہو کر باہر کے دِلفریب نظارے دیکھنے میں مشغول تھی ۔ اِسی بیچ اسپتال سے ملحق موٹر سائیکلوں کے شوروم کی چھت سے بندروں کا جھنڈ بالکنی میں داخل ہو گیا۔ اچانک بندروں کو اپنے نزدیک دیکھ کر ڈاکٹر سیما گویل گھبرا گئی۔ وہ بندروں سے بچنے کی کوشش میں پیچھے ہٹی اور توازن کھوتے ہوئے بالکنی سے نیچے سڑک پر گر گئی۔ موقع واردات پر ہی ڈاکٹر سیما گویل کا انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹر سیما گویل کی موت سے اسپتال میں افراتفری مچ گئی۔ ڈاکٹر آر۔ کے۔ گویل، بیٹا انکت اور بیٹی رشمی دوڑتے ہوئے موقع واردات پر پہنچ گئے ۔ اسپتال کا عملہ اور مریضوں سے ملنے آئے تیماردار بھی لاش کے اردگرد جمع ہو گئے۔ ڈاکٹر گویل اور ڈاکٹر انکت نے ڈاکٹر سیما گویل کی نبض چھو کر دیکھی، لیکن وہ مر چکی تھی۔ رشمی اور انکت دہاڑیں مارتے ہوئے ماں کی لاش سے چپٹ گئے۔ ڈاکٹر آر کے گویل کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے تر تھیں۔ خبر ملتے ہی پولیس موقع پر پہنچ گئی ۔ پولیس کارروائی اور پنچ نامہ کے بعد اگلے دِن لاش کا پوسٹ مارٹم ہوا۔ اَب لاش کی آخری رسومات ادا کرنے کی باری تھی۔

ڈاکٹر آر کے گویل کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر سیما گویل کی موت ہو نے کے باوجود برادری یا کالونی کا کوئی بھی فرد اُن کی خبر گیری کو نہیں آیا۔ چند رشتہ داروں کے علاوہ نہ تو کوئی اُنہیں پُرسا دینے آیا اور نہ ہی کوئی بندہ پوسٹ مارٹم کی کارروائی میں شریک ہوا۔ یہ دیکھ کر ڈاکٹر انکت اور ڈاکٹر رشمی بھی بے چین ہو گئے۔ وہ

یہی سوچ رہے تھے کہ آخر کیا بات ہے کہ کسی نے بھی اُن کی ماں کی موت اور حادثہ کی بابت جاننے کی کوشش نہیں کی؟ ڈاکٹر گویل بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اُنہیں یقین تھا کہ اگر کالونی والے اپنے کام کاج میں گھرے ہونے یا عدیم الفرصتی کی وجہ سے نہ بھی آپائے، تو برادری کے لوگ تو آئیں گے ہی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ نہ کوئی برادری والا آیا اور نہ ہی غیر برادری کا کوئی شخص حاضر ہوا۔ لاش کے پاس ڈاکٹر گویل، انکت، رشمی، چند رشتہ دار اور اسپتال کے عملے کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ اِسی درمیان اسپتال کے ایک چپراسی نے آکر بتایا کہ قریب قریب کالونی کے سبھی لوگ اپنے اپنے کام پر جا چکے ہیں۔ زیادہ تر لوگوں نے اپنی اپنی دُکانیں کھول رکھی ہیں اور مزدور طبقہ کے لوگ محنت مزدوری کرنے چلے گئے ہیں۔

یہ سن کر ڈاکٹر گویل کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی، انکت اور رشمی کا چہرہ فق ہو گیا۔ اُنہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ برادری اور کالونی کے اشخاص اُن کے ساتھ ایسا برتاؤ کریں گے۔ لاش کی آخری رسم میں دیر ہو رہی تھی۔ برادری اور کالونی کے لوگوں کے نہیں آنے کا ماجرا اُن کی سمجھ میں آچکا تھا۔ بچوں کو تسلی دے کر وہ گھر سے باہر نکل آئے۔ ڈاکٹر آر کے گویل نے چوراہے سے رکشا لیا اور منڈی پہنچ گئے۔ اُنہوں نے ایک بزرگ سے پلہ دار کو اپنے پاس بُلایا۔ اسے میت کی آخری رسم پوری کرنے کے لئے وقت پر رشتہ داروں کے نہیں پہنچنے کی بات سمجھاتے ہوئے لاش کو چِتا تک پہنچانے کے لئے منھ مانگی اُجرت پر ایک درجن پلہ داروں کو ساتھ لے کر اَپنے ہمراہ چلنے کو کہا۔ پلہ دار نے ایک نظر ڈاکٹر صاحب پر ڈالی اور پھر اپنے ساتھیوں کی سمت دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ ڈاکٹر گویل کے ٹوکنے پر اُس نے دیگر پلہ داروں کو ایک طرف لے جاتے ہوئے اُن سے مشورہ کیا اور اُنہیں میت کی آخری رسم ادا کرانے میں مدد کے لئے راضی کر لیا۔

تھوڑی ہی دیر میں ایک درجن پلہ دار ڈاکٹر گویل کے ساتھ اُن کے گھر آ گئے۔ دُور کے ایک پنڈت اپنی بیوی کو لے کر حاضر ہو گئے تھے۔ رشمی اور اسپتال کی

نرسوں کی مدد سے پنڈتائن نے لاش کو نہلایا اور اُسے کفن دینے کا کام کیا۔ میت تیار ہونے پر نزدیکی رشتہ داروں نے اَرتھی اُٹھائی اور" رام نام سَت ہے، سَت ہے بھائی سَت ہے، سَت ہی گت ہے"، جیسے نارے لگاتے ہوئے مرگھٹ کی طرف چل دئے۔ اِس دوران ایک پلہ دار ڈھول بجاتا ہوا ساتھ چلا، ایک پلہ دار نے اَرتھی کے اُوپر کھیل بتاشے پھینکنے کی رسم ادا کی۔ایک پلہ دار گھنٹی بجاتا ہوا پیچھے پیچھے چل رہا تھا تو دوسرے کے ہاتھ میں کچھ ضروری اشیاء (سامگری) تھی۔ایک رکشا میں لکڑیاں، گھی و دیگر ضروری سامان رکھا تھا۔ شہری آبادی کے باہرایک جگہ پِنڈ دان کی رسم پوری کی گئی۔اس کے بعد میں شمشان گھاٹ پہنچ کر وہاں بنے چبوترے پرلکڑیاں رکھ کر چِتا تیار کی گئی۔لاش کولکڑیوں پر لٹا کراوپر سے بھی لکڑیاں رکھی گئیں۔ جلدی آگ پکڑنے کے مدِّنظر لکڑیوں پر گھی ڈالا گیا۔ بیٹے انکت نے چِتا میں آگ لگائی اور کندھے پر رکھی مٹی کی گھڑیا میں سوراخ سے گرتے پانی کے ساتھ چِتا کا چکر لگایا۔آخری رسومات کی ادائیگی کے بعد سبھی لوگ گھر لوٹ آئے۔ ڈاکٹر گویل نے بروقت کام آنے والے پلہ داروں کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے اُنہیں طے شدہ اُجرت سے زیادہ رقم دیتے ہوئے رُخصت کر دیا۔

ڈاکٹر آر کے گویل اتنے پریشان پہلے کبھی نہیں دِکھے گئے، جتنا کہ آج تھے۔ اُنہوں نے بیٹے انکت اور بیٹی رَشمی سے کچھ نہیں چھپایا۔دولت کے گھمنڈ اور خود پیدا کردہ اَنا کے سبب دولت سے سب کچھ حاصل کرنے کی غفلت پال لینے والے ڈاکٹر گویل نے برادری وسماج سے کنارہ کشی کی پوری کہانی سے بیٹی و بیٹے کو آگاہ کرتے ہوئے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ اِسی کے ساتھ اُنہوں نے اپنے بچوں سے ہر حال میں برادری وسماج سے جُڑے رہنے کی نصیحت بھی کی۔

ڈاکٹر گویل نے شام کو اپنی برادری کے سبھی لوگوں کے ساتھ کالونی والوں کو جمع کیا۔ کالونی اور برادری کے لوگ شاید اِسی موقع کے کے منتظر تھے۔ایک ہی بُلاوے میں سب حاضر ہو گئے۔ ہر کوئی خاموش تھا۔کوئی کچھ بولنے کو تیار نہیں تھا۔آخرکار

نوجوت سنگھ نے سکوت توڑتے ہوئے پوچھا، ''ڈاکٹر صاحب! بتایئے، کالونی والوں اور برادری کے لوگوں کو کیوں طلب کیا گیا ہے؟''

ڈاکٹر صاحب سے طنز کی شمولیت والے سوال کا کوئی جواب نہیں بنا۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوگئے اور چھلکی آنکھوں سے صرف اِتنا ہی کہہ پائے، ''بھائیوں مجھے معاف کردو۔ مداوات کا ایک موقعہ دے دو۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی! کبھی نہیں ہوگی!!''

OO

(مارچ ۲۰۱۷ء)

سنیچر کا کرب

شالنی اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی تھی۔ اُس کا دھیان سامنے دیوار پر ٹنگے کلینڈر پر مرکوز تھا۔ سنیچر کا دن ہونے کی وجہ سے وہ آج گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ وہ پوری طرح وہم کا شکار تھی۔ اُس نے اپنے ذہن و دماغ میں گھر کر گئے فرسودہ خیالات اور اس کے تحت کسی اَنہونی کے تصور سے خود کو باہر نکالنے کی بارہا کوشش کی، لیکن سنیچر کے روز رونما ہونے والے چھوٹے موٹے کئی حادثات کی یاد تازہ بنی رہنے کی وجہ سے وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے نئے دَور میں اپنے دقیانوسی خیالات کوشکست دینے کی جہد کر رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اچانک بجی کال بیل نے اُس کا دھیان منتشر کر دیا۔

شالنی اپنے بیڈ سے اُتری اور آگے بڑھ کر دروازہ کا ہینڈل پکڑ کر اُسے کھول دیا۔ سامنے سادھوی اور شاہین کھڑی تھیں۔ اُنہیں دیکھ کر وہ حیران و ششدر رہ گئی۔ اُس کی دونوں دوست زندہ وسلامت اُس کے سامنے موجود تھیں! اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا!! اُس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کو ملا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہی ہے۔ اُس کی اِس حرکت سے سادھوی اور شالنی کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہی دوست جو 25 اپریل 2015ء کو نیپال میں آئے زلزلے میں اُس کی آنکھوں کے سامنے قطب مینار کے ملبے میں دَب گئی تھیں۔ ملبے کے ڈھیر میں کسی شخص کے زندہ وسلامت بچنے کی اُمید کسی کو نہیں تھی۔ کئی دوسرے

لوگوں کی طرح اُنہیں بھی مُردہ مان لیا گیا تھا۔ لیکن آج وہی دونوں اُس کے سامنے موجود تھیں۔ شالنی اپنی سہیلیوں کو زندہ و سلامت پا کر بہت خوش ہوئی اور اُن سے چپٹ کر دیر تک روتی رہی۔ اُس کی آنکھوں سے بہنے والے خوشی کے آنسو رُکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ اُس نے دوستوں کی سلامتی پر ایشور کا شکریہ ادا کیا۔

شالنی اُنہیں کمرے میں لے آئی۔ تینوں نے پیار بھری نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کرسیوں پر دراز ہو گئیں۔ شالنی کو خیال آیا کہ جس دِن بھونچال آیا تھا وہ منحوس دِن سنیچر کا تھا اور آج بھی سنیچر ہے۔ سنیچر کے زلزلے نے اُس سے اُس کے دوستوں کو چھین لیا تھا اور آج کے سنیچر نے اُنہیں زندہ واپس دے دیا۔ یقیناً یہ سنیچر اُس کے لئے بہت بڑی خوشی لے کر آیا ہے۔ اُس نے سادھوی اور شاہین کو اپنی طرف مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اَب وہ اپنی زندگی میں کبھی بھی سنیچر کے وہم کو جگہ نہیں دے گی۔ سبھی دِن ایک جیسے ہوتے ہیں ۔ رہی بات کچھ بُرا ہونے کی، تو ایسا کبھی بھی اور کہیں بھی ہو سکتا ہے۔ شالنی کے سنیچر کی دقیانوسی قید سے باہر نکل آنے پر دونوں سہیلیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اُنہوں نے شالنی کو مبارک باد دے کر اُس کا حوصلہ بڑھایا اور ثابت قدم رہنے کی دُعائیں دیں۔

چائے پانی اور بات چیت کے دوران شالنی پھر کہیں دُور خیالوں میں کھو گئی۔ اُس کے ذہن میں نیپال میں آئے زلزلے کا تصور اُبھر آیا۔ فلمی پردہ کی طرح ذہن میں اُبھرتے مناظر سے شالنی کا بدن لرز اُٹھا ۔ کتنا خوفناک تھا وہ زلزلہ؟ کتنا ہولناک تھا وہ منظر؟

دراصل اِس چھوٹی سی زندگی میں شالنی کو جہاں کئی طرح کی کامیابیاں میسّر آئیں، وہیں اُس کے کئی کام بگڑے بھی۔ یہ عجیب اتفاق ہی رہا کہ کام خراب ہونے والے زیادہ تر واقعات سنیچر کے دِن رونما ہوئے ۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے کام کاج میں سنیچر کے عمل دخل کو یقین کی حد تک فوقیت دینے لگی تھی۔ سنیچر کے روز وہ کافی چوکنا رہتی تھی ۔ اِس کے باوجود ہونے والی بات ہو کر رہتی۔ اچھے اور بُرے کام کی شروعات میں

بھروسہ رکھنے والی شالنی اکثر گھر سے باہر نکلتے وقت اِس بات کا خاص خیال رکھتی کہ کوئی کُتّا اُس کے سامنے سے نہ گذر جائے۔ سفید ملبوس میں لپٹی کسی بیوہ کو دیکھ کر بھی وہ ناک بھوں چڑھا کر اپنے کپڑوں کو سمیٹتے ہوئے ایک جانب ہٹ جاتی تھی۔ اتنا ہی نہیں رات کے وقت اُلّو کے بولنے یا بلّی کے رونے پر وہ صبح ہوتے ہی یہ پتہ لگانے میں جُٹ جاتی تھی کہ اُس کے رِشتہ داروں یا محلّہ میں کسی شخص کی موت تو واقع نہیں ہوگئی ہے۔ کسی کو چھینک آنے پر وہ اعتراض کرتی ہوئی بُرا سا منہ بناتی اور کچھ دیر کے لئے اُسی جگہ پر کھڑی ہو کر منحوس گھڑی ٹلنے کا انتظار کرتی۔

ایک مرتبہ بھرے بازار میں ایک عورت کو چھینک آ گئی۔ اُس کے پیچھے چل رہی شالنی فوراً رُک کر کھڑی ہوگئی۔ بغیر سوچے سمجھے بیچ راستے میں ٹھہرنے کا خمیازہ بھی اُسے بھگتنا پڑا۔ پیچھے سے آ رہی تیز رفتار بائیک نے اُسے ٹکّر ماردی۔ سڑک پر گر کر زخمی ہوئی شالنی کو کئی دِن تک اسپتال میں داخل رہنا پڑا۔ تعلیم کے معاملے میں پوسٹ گریجویٹ ہونے کے باوجود وہ اوہام کا شکار تھی۔ اُسنے فاسد اور دقیانوسی تخیلات کی بوسیدہ زنجیر توڑنے کی کئی بار کوشش کی، لیکن ہر بار ناکام ہی رہی۔ شالنی کی زندگی میں کبھی نہ کبھی سنیچر کے روز ایسا واقعہ پیش آ ہی جاتا، جس کی وجہ سے وہ اپنے دماغ کے اُوپر پڑی وہم کی دبیز چادر کو اُتار کر پھینکنے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔

شالنی جب، سادھوی اور شاہین کے ساتھ نیپال گھومنے گئی تھی، تب ایک خوف بھی وہ اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ ہفتہ بھر کی وِزِٹ میں ایک سنیچر آنا لازمی تھا، سو آیا۔ وہ بھی خطرناک! خطرناک بھی اتنا، جس کے بارے میں کبھی سوچا نہیں تھا۔ اُس سنیچر کو بھول پانا شاید ممکن نہیں۔ سنیچر ہونے کی وجہ سے شالنی کا اِرادہ کمرے سے باہر کہیں جانے کا نہیں تھا، مگر سہیلیوں کی ضد کے سامنے اُس کی ایک نہ چلی۔ وہمن کہہ کر ہنسی اُڑانے کی بِنا پر اُسے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ تینوں گھومتے گھامتے کاٹھمنڈو کا قطب مینار کہے جانے والے دھرہراٹاور پر پہنچ گئیں۔ اُنہوں نے ٹاور پر چڑھ کر چاروں سَمت دیکھا۔ کافی دیر تک کاٹھمنڈو کے دِلفریب اور حسین نظارے دیکھنے کے بعد تینوں مینار

سے نیچے اُتر آئیں۔ 50.50 میٹر اُونچے دھرہرا ٹاور کو 1832ء میں اُس وقت کے وزیرِاعظم بھیم سین تھاپا نے تعمیر کرایا تھا۔ ٹاورر کے اُوپر بھگوان شِو کی ایک چھوٹی سی مورتی نصب تھی۔ اِس 9 منزلہ مینار میں اوپر چڑھنے کے لئے 200 گھُماؤدار سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ سیڑھیاں چڑھنے اور پھر بعد میں اُترنے کی وجہ سے تینوں کافی تھک گئی تھیں۔ کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے وہ ٹاور سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گئیں۔ تینوں ٹاور پرنسب بھگوان شِو کی مورتی کو ایک ٹک نہار رہی تھیں۔ اُنہیں بُلند مینار کی بالائی منزل تک چڑھ جانے پر بڑی حیرت تھی۔ شالنی کی کلائی پر بندھی گھڑی میں دِن کے 11.41 کا وقت ہوا تھا۔ اچانک اُنہیں شِو جی کی مورتی ہلتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ خود بھی ہلنے لگیں۔ دھرتی کانپ اُٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے تاریخی دھرہرا ٹاور لہراتے ہوئے دھم سے زمین پر آ گرا۔ آس پاس کی تمام عمارتیں زمیں بوس ہوگئیں۔ شالنی سے ذرا سے فاصلے پر بیٹھیں سادھوی اور شاہین پر بھی مینار کا ملبہ گرا۔ اُنہیں ملبے کے ڈھیر میں دبا دیکھ شالنی کی چیخ نکل گئی۔ اپنے اُوپر گرے ملبے کے ٹکڑوں سے لگی چوٹ کی پرواہ کئے بغیر اُس نے مدد کے لئے ادھر اُدھر دیکھا۔ سہیلیوں کو ملبے سے باہر نکالنا اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔ چاروں طرف چیخ و پکار مچی تھی۔ بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ جو کوئی جس حالت میں تھا، اُسی حالت میں بھاگ کھڑا ہوا۔ جگہ جگہ کھڑے پیڑ اور عمارتیں تاش کے پتوں کی مانند بکھر کر ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ لوگ اپنی جان بچانے کے لئے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ افراتفری کا عالم تھا۔ کوئی کسی کی مدد کرنا تو دُور بات سُننے تک کو تیار نہیں تھا۔ شالنی کی سہیلیاں اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس مینار کے ملبے میں زندہ دفن ہوگئیں، جس کے اُوپر سے کچھ دیر قبل ہی وہ نیچے اُتری تھیں۔ اُسے لگا کہ اگر شاہین اور سادھوی بھی اُس کے برابر میں بیٹھی ہوتی، تو شاید بچ جاتیں۔ تھوڑی بہت چوٹ بھی لگتی، تو کوئی بات نہیں تھی۔ کم سے کم زندہ تو رہتیں۔ لیکن زلزلہ بھیجنے والی سب سے بڑی طاقت کو شاید یہ منظور نہیں تھا۔ موقع پر پہنچے راحت مہیا کرانے والے دستے کے جوانوں نے جہاں مینار کے ملبے سے کئی چوٹ زدہ زخمی

اشخاص کو زندہ باہر نکالا، وہیں 180 لوگوں کی لاشیں بھی برآمد کیں۔
شالنی کو بعد میں معلوم ہوا کہ ریکٹر پیمانے پر اِسکی شدّت 7.9 درج کی گئی تھی۔ زلزلہ کا مرکز کاٹھمنڈو سے 77 کلومیٹر دور شمال مغرب میں پوکھرا میں تھا۔ زلزلہ کے ماہرین کا کہنا ہے کہ صفر سے 5.9 ریکٹر اسکیل کے زلزلہ میں کھڑکیاں ٹوٹ سکتی ہیں، دیوار پر ٹنگے فریم گر سکتے ہیں، عمارتوں کی بُنیادیں ہل سکتی ہیں اور عمارتوں کی اُوپری منزلوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ 7 ریکٹر پیمانہ سے اُوپر کی منزلوں میں عمارتیں گرنے اور زمین پھٹنے کے واقعات کے ساتھ بڑے پیمانے پر جان و مال کا نقصان ہوسکتا ہے۔ نیپال میں زلزلے پہلے بھی آتے رہے ہیں۔ 1934 میں نیپال میں 8.3 شدّت کا زبردست زلزلہ آیا تھا، جس میں قریب 10 ہزار افراد لُقمہ اجل بن گئے تھے۔ اِس سے قبل 1897 میں 8.5 ریکٹر والا خوفناک زلزلہ آیا تھا۔ تقریباً 80 برس بعد آئے اِس زلزلے میں ہلاک شدگان کی تعداد 8000 کو تجاوز کر گئی۔ 50,000 سے زیادہ لوگ زخمی ہوگئے۔ قریب 30 لاکھ افراد کو اپنے گھروں سے بے گھر ہونا پڑا۔
زلزلے میں جان و مال کا زبردست نقصان ہوا۔ شالنی نے تباہی کے ایسے مناظر پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اپنی آنکھوں کے سامنے زندہ لوگوں کو لاشوں میں تبدیل ہوتے دیکھنے کا درد اُس کے شعور میں آج بھی تازہ تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شاید یہ قدرت کا عذاب ہی تھا، جسے انسانوں کے بداعمال کی سزا کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ قدرت کی طاقت بہت بڑی ہے۔ اس کے آگے کسی کا بس نہیں۔
قابلِ غور یہ بھی ہے کہ جان و مال کے زبردست نقصان اور عام لوگوں کو گھر سے بے گھر کر دینے والے ہولناک مناظر کے درمیان کچھ لوگ بڑی ڈھٹائی سے انسانیت کی تمام حدیں پار کرتے نظر آئے۔ آڑے وقت میں مددگار ثابت ہو سکنے والے بے داد پر اترے افراد کو آخر کس نظریہ سے دیکھا جانا چاہئے؟ کچھ ایسا ہی ہوا تھا اُس دِن۔ زلزلے سے متاثر افراد اپنی جان بچانے کے لئے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ سیلانی ایئرپورٹ کی طرف گامزن تھے۔ دوسرے لوگوں کی طرح شالنی بھی بوجھل

قدموں سے اُن کے ساتھ چل پڑی۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے زلزلے کے جھٹکے لگاتار آرہے تھے۔ کچھ فاصلے پر چند ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ ٹیکسیاں دیکھ کر جان میں جان آئی۔ یوں لگا جیسے بہت بڑی راحت مِل گئی ہو۔ پریشان حال سیلانیوں کو اپنا وطن اور اپنی منزل نزدیک دِکھائی دینے لگی۔ لیکن یہ کیا؟ اُن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مصیبت کی اِس گھڑی میں اُن کے ساتھ غیر انسانی سلوک بھی ہو سکتا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور صرف 6 کلومیٹر کی دُوری طے کرانے کا کرایہ 6000 روپے مانگ رہے تھے!!!

شالنی کو لگا کہ شاید ڈرائیور نے غلطی سے سیکڑے کی جگہ ہزار کا لفظ استعمال کر دِیا ہے۔ اُس نے کہا، ''ہاں بھائی ہاں! ہم آپ کو کرایہ کے 600 روپے ہی دیں گے۔ ہمیں جتنی جلدی ہو سکے، ہوائی اڈے پہنچا دو۔'' اس پر ڈرائیور نے بڑے روکھے انداز میں شالنی کی خوش فہمی دُور کرتے ہوئے کہا، ''میڈم سو نہیں، ہزار!! 6000 روپے فی سواری کرایہ چکانا ہوگا۔''

یہ سن کر سب لوگ ہکا بکا رہ گئے۔ کئی گھبرائے شخص منھ مانگا کرایہ پیشگی ادا کر ٹیکسی لے گئے اور کچھ وہیں کھڑے قدرت کے قہر کے بعد انسانوں کے غیر انسانی ستم کو ایک ٹک دیکھتے رہ گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے زلزلے میں مرنے والے انسانوں کے ساتھ انسانیت بھی مر گئی ہے۔ شالنی کو کُچھ فاصلے پر وہی ٹیکسی ڈرائیور اپنی ٹیکسی لئے کھڑا نظر آیا، جس کی ٹیکسی میں تینوں دوست ایئر پورٹ سے ہوٹل تک آئے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور کا رویّہ اتنا اچھا تھا کہ اُس دِن وہ دیر شام تک اُس کی ٹیکسی میں شہر کے خاص مقامات گھوم آئے تھے۔ اُس کی انسان دوستی اور سیلانیوں کے ساتھ اچھے برتاؤ سے تینوں بہت متاثر تھیں۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑی ہی دیر میں ڈرائیور کے ساتھ اُن کی کافی حد تک بے تکلفی ہو گئی تھی۔ تاریخی مقامات کی سیر کے علاوہ وہ کھانے پینے کے دوران بھی بنا کسی تفریق کے اُن کے ساتھ شامل رہا تھا۔ اُس نے اپنا نام گجیندر بتایا تھا ۔ شالنی کو لگا کہ ایسے مشکل حالات میں صرف گجیندر ہی اُس کی مدد کر سکتا ہے۔

اِسی امید کے ساتھ شالنی تیز قدم اُٹھاتے ہوئے اُس کی طرف لپکی۔ اُس نے

اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا، ''گجیندر! میں وہ بہت پریشانی میں ہوں۔ جتنی جلدی ہو سکے مجھے ایئر پورٹ پہنچا دو۔'' گجیندر کے اپنی طرف توجہ دینے کی بجائے کچھ فاصلے پر کھڑے دیگر مسافروں کے ساتھ سودے بازی کرتے ٹیکسی ڈرائیوروں کی طرف دھیان مرکوز کرنے پر شالنی حیران رہ گئی۔ اُس نے کہا، ''گجیندر! تم نے شاید مجھے پہچانا نہیں ہے!! میں شالنی ہوں۔ شالنی!!! چار دِن پہلے تم ہوائی اڈے سے اپنی ٹیکسی میں بٹھا کر ہمیں ہوٹل لے گئے تھے۔ اتنا ہی نہیں، تم نے ہمیں شہر بھی گھمایا تھا۔ میرے ساتھ سادھوی اور شاہین بھی تھیں۔ میری سہیلیاں۔ لیکن اَب وہ اِس دُنیا میں نہیں رہیں۔ زلزلے کے قہر نے اُنہیں مجھ سے چھین لیا۔ میں اکیلی رہ گئی۔ گجیندر! تم سُن رہے ہو نہ؟ میں کیا کہہ رہی ہوں؟ یہ ٹیکسی ڈرائیور ہوائی اڈے کا کرایہ......''

''میڈم، شالنی۔ میں آپ کو پہچانتا بھی ہوں اور آپ کو سن بھی رہا ہوں۔ آپ کے دوستوں کے بارے میں سن کر بہت دُکھ ہوا۔ ہونی کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ زلزلہ شدید تھا۔ سینکڑوں عمارتیں زمیں بوس ہوگئیں۔ بڑی تعداد میں لوگ ہلاک ہوگئے۔ جان و مال کا کافی نقصان ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر گجیندر خاموش ہوگیا۔

''گجیندر ہم قطب مینار گھومنے آئے تھے، تبھی زلزلہ آ گیا۔ زلزلے کے جھٹکوں نے سب کچھ تہہ و بالا کر دیا۔ ہوٹل جس میں ہم ٹھہرے تھے، پتہ نہیں اُس کا کیا حال ہے؟ نقدی، سامان اور شوپنگ کر لائی گئی تمام اشیاء کمرے میں ہی تھیں۔ اَب اُن کی آس بے معنی ہے۔ حالات سازگار نہیں ہیں۔ دِل ٹوٹ کر زخمی ہوگیا ہے۔ وطن واپس جارہی ہوں۔ کبھی نہ بھرنے والے زخم لئے۔ کبھی نہ بھولنے والا درد لئے۔ مجھے ہوائی اڈے تک پہنچا دو۔'' شالنی نے ملتجی انداز میں اپنی بات پوری کی۔

''میڈم، میں آپ کو ایئر پورٹ تو پہنچا دونگا، لیکن......''

''لیکن کیا؟'' شالنی نے اُس کی بات بیچ میں ہی کاٹ دی۔

''میڈم! زلزلے میں سڑکیں بُری طرح ٹوٹ گئی ہیں۔ کئی جگہ عمارتوں کا ملبہ گرنے سے راستے بند ہیں۔ یہاں سے ہوائی اڈے کا فاصلہ چھ کلو میٹر تو ضرور

ہے،لیکن ہے خطرہ سے بھرا ہوا! بہتر ہو کہ آپ رفیوجی کیمپ میں چلی جائیں ۔وہ نزدیک ہی ہے۔حالات بہتر ہو جانے پر وطن لوٹ جانا۔

شالنی کو لگا کہ وہ بھی شاید کرائے کا لالچی ہے اور اُسے ٹالنے کی کوشش کر رہا ہے۔اُس نے کہا، ''گجیندر! ایسے دردناک، ماتمی اور پریشان کن حالات میں انسان دوستی کا ثبوت دیا جاتا ہے۔ایک انسان دوسرے انسان کی ہر ممکن مدد کرتا ہے۔لیکن یہاں کے ٹیکسی ڈرائیور تو پوری طرح غیر انسانی حرکت پر اُتر آئے۔ انسان دوستی کا جذبہ دکھانے کی بجائے مجبور اور وقت کے ستائے لوگوں کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں! ایسا لگتا ہے کہ دھندے کے سامنے انسانیت ہی ختم ہو گئی ہے!! ضمیر فروش کہیں کے!!!''

شالنی کے ٹیکسی میں بیٹھنے کے ساتھ ہی کئی دیگر سیلانی بھی اندر گھس گئے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے زلزلے کے جھٹکے اَب بھی آ رہے تھے۔ٹیکسی چل پڑی۔ٹیکسی ڈرائیوروں کے عجیب رویّہ کو لے کر شالنی کے چہرے پر غصّہ و نفرت کے ملے جلے نقوش اُبھر آئے۔عام حالات میں یہی ڈرائیور سواریوں کو دیکھ کر کس طرح نرم خو اور مہمان پرست ہو جاتے ہیں؟ اِدھر آئے صاحب۔کہاں جانا ہے میڈم؟ ہوٹل یا کہیں اور؟ میں جلدی اور کم کرایہ میں پہنچا دونگا۔ میری ٹیکسی میں آیئے سر! میری گاڑی میں بیٹھئے میڈم!! اور اَب وہی ڈرائیور!!! چہرے کے پیچھے چھپا چہرہ سامنے آنے پر وہ سوچ میں پڑ گئی۔اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا، آخر انسان دو چہرے کیوں رکھتا ہے؟ اصلی چہرے سے الگ ایک نقلی چہرہ کیوں ہوتا ہے؟

راستے میں دِکھے تباہی کے مناظر اور انسانی زیاں اُس کی برداشت سے باہر تھے۔اُسنے ٹیکسی سے باہر دیکھنا بند کر دیا اور آنکھیں موند لیں۔ ہوائی اڈے پر پہنچ کر ٹیکسی رُک گئی۔شالنی نے اپنے پرس میں روپے دیکھے۔4000سے کچھ اُوپر تھے۔اُس نے اپنی انگلی سے سونے کی انگوٹھی نکالی اور روپیوں کے ساتھ گجیندر کی طرف بڑھا دی۔

گجیندر مسکرا کر رہ گیا۔اُس نے ہمدردی اور انسان دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے

کرایہ و انگوٹھی لینے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ لالچی اور ضمیر فروش نہیں تھا۔ اِن حالات میں اُس نے شالنی ہی نہیں دیگر مسافروں سے بھی کرایہ نہیں لیا تھا۔

سادھوی اور شاہین لگاتار چھت کی طرف دیکھے جا رہی شالنی کی ایسی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ شاہین نے شالنی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اُسے جھنجھوڑتے ہوئے خواب غفلت سے جگایا۔ ''کہاں کھو گئی ہو، شالنی، میڈم؟''

''کہیں نہیں! کہیں نہیں!! بس یوں ہی کچھ یاد آ گیا تھا۔ آپ لوگ سنائیے، زلزلے کے بعد کیا ہوا تھا؟'' شالنی نے دوستوں کی طرف مسکراہٹ بھری نگاہ ڈالتے ہوئے جاننا چاہا۔

شاہین نے بتایا، ''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ دھرہرا ٹاور کے ملبے کے نیچے کئی خوش نصیب زندہ بچ گئے تھے وہ دونوں بھی بڑے پتھروں کے بیچ بن گئی خالی جگہ کے درمیان محفوظ رہیں۔ ٹانگوں میں ضرور چوٹیں آئیں۔ کچھ دیر بعد موقع پر پہنچے امدادی دستوں نے ملبے کے نیچے سے زندہ لوگوں کو باہر نکالا۔ اسی درمیان وہاں گجیندر پہنچ گیا اور اُنہیں اپنی ٹیکسی میں اسپتال لے گیا۔''

''کیا؟ گجیندر تمہیں اسپتال لے گیا!'' شالنی نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں! گجیندر ہمیں اسپتال لے گیا تھا۔ تمہیں ہوائی اڈے چھوڑ کر وہ فوراً وہاں پہنچ گیا تھا۔ ہمارے ٹاور کے ملبے میں دفن ہو جانے کی جانکاری تم نے ہی اُسے دی تھی۔ اسپتال میں ہماری مرہم پٹی کی گئی۔ میری داہنی اور سادھوی کی بائیں ٹانگ کی ہڈی میں معمولی فریکچر دیکھتے ہوئے ٹانگوں پر پلستر چڑھایا گیا۔ اِس بیچ گجیندر بلا ناغہ صبح و شام ہم سے ملنے اسپتال آتا رہا۔ وہ جب بھی آتا، اپنے ساتھ پھل اور کھانے پینے کا کچھ نہ کچھ سامان ضرور لاتا۔ پلستر کٹنے کے بعد ہمیں وطن لوٹنے کی اجازت مل گئی۔'' سادھوی نے جواب دیا۔ ہم شام ہی گھر پہنچے اور اَب تم سے ملنے چلے آئے۔'' شاہین نے ایک ہی بار میں ساری کہانی کہہ سنائی۔

سادھوی نے گجیندر کے ذکر پر بار بار مسکراتی شالنی سے مخاطب ہوتے ہوئے

کہا، ''گجیند ر واقعی بہت اچھا لڑکا ہے۔ اُس کی اچھائی اور انسان دوستی کا اندازہ اِسی سے ہو جاتا ہے کہ اُس نے وطن لوٹنے والے جن مسافروں کو اپنی ٹیکسی سے ایئر پورٹ پہنچایا تھا، کسی سے بھی کرایہ نہیں لیا تھا!''

○○

(جون ۲۰۱۷ء)

نیک عمل

دِن ڈھلے دفتر سے لوٹے خالد کا مسرت سے لبریز چہرہ دیکھ کر نبیلہ کا چہرہ بھی کھل اُٹھا۔اس سے قبل خالد جب بھی گھر میں قدم رکھتے ، چہرے پر مسکراہٹ لئے نبیلہ شوہر کا استقبال کرتی تھی۔ گذشتہ تیس برس سے اُس کا یہی معمول تھا۔دِن بھر فائلوں کے اوراق اُلٹنے اور کام کاج کے ساتھ دماغ ماری کے سبب ہونے والی تکان نبیلہ کے مسکراتے چہرہ پر نظر پڑتے ہی بہت حد تک دور ہو جاتی تھی۔

ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی نبیلہ آگے بڑھتی،خالد کا استقبال کرتی اور اُن کے ہاتھ سے بیگ لے کر نزدیکی ٹیبل پر رکھ دیتی۔ جسم سے کوٹ اُتارنے میں مدد کرتی۔کوٹ کی گرفت سے آزاد ہونے کے بعد خالد زوردار انگڑائی لیتے اور پھر ڈھیلے بدن سوفہ پر پسر جاتے۔نبیلہ خالد کے سامنے بیٹھتی ، جوتوں کے تسمے ڈھیلے کرتی ، جوتے اُتارتی اور پھر پیروں پر چڑھے موزے نکالنے لگتی۔ جوتے اُتارتے ہی موزوں سے نکلنے والی بدبو کا بھبکا اُس کی ناک میں گھس جاتا۔ اُسے متلی کا سا احساس ہوتا ، لیکن سمجھوتہ پسند نبیلہ نے خود کو ذہنی طور پر اس کام کے لئے مکمل طور پر مضبوط کر لیا تھا۔کچھ دیر ناک بند رکھتی اور پھر جلدی سے جوتے موزے ہٹا کر اُنہیں اُن کی مخصوص جگہ پر رکھ آتی۔ کام سے فراغت پا کر نبیلہ کچن میں گھس جاتی ۔ جلدی سے گرما گرم چائے بناتی، کچھ سینڈوچ تیار کرتی اور اُنہیں قرینہ سے ٹرے میں سجا کر میز پر لا رکھتی ۔ چائے کا ایک کپ خالد کی طرف بڑھا دیتی اور دوسرا کپ اپنے ہاتھ میں تھام کر دھیرے

دھیرے چائے سِپ کرنے لگتی۔ بیوی کے ساتھ ہلکا پھلکا ناشتہ کر خالد کچھ دیر آرام کرتے اور پھر نہا دھو کر گھومنے کے لئے گھر سے باہر نکل جاتے۔ کبھی کبھی گھر کے لئے کچھ ضروری سامان کی خریداری کرنی ہوتی یا پھر کوئی پُرانی فلم دیکھنے کا موڈ بنتا، تو نبیلہ بھی تیار ہو کر خالد کے ساتھ باہر چلی جاتی۔

ایسا پہلی بار ہوا، کہ خالد دفتر سے ہی بے حد خوش و خرم موڈ میں لوٹے۔ اس کے باوجود نبیلہ نے حسبِ معمول اپنے کام کو انجام دیا۔ اُس نے چائے کا کپ شوہر کی جانب بڑھاتے ہوئے کچھ اِس انداز میں دیکھا، جیسے وہ چہرے پر اُبھرے گلستاں میں لہلہاتے پھولوں کی خوشبو کو قید کرنے کے لئے بیتاب ہو۔ خالد بھی اپنے آپ کو نبیلہ کی آنکھوں میں اُبھرے سوال کو پڑھنے سے نہیں روک سکا۔

آخرکار تھوڑے سے توقف کے بعد خالد نے راز سے پردہ اُٹھاتے ہوئے کہا، ''نبیلہ! تم جانتی ہی ہو کہ میں نے اپنی پوری زندگی روپیہ کمانے کی تگ و تاز میں گذار دی۔ وجوہات سے بھی تم اچھی طرح واقف ہو۔ تمہارے علم میں یہ بھی ہے کہ ہمیں روپیوں کی کس قدر ضرورت رہی۔ گھر کے آنگن میں معصوم بیٹے کی گونجتی کلکاریاں ہمارے لئے باعثِ مسرت تھیں۔ خاندان کے وارث کے روپ میں ہمارا کام ایک بیٹے سے چل سکتا تھا، لیکن تمہیں اس کے جوڑی دار کی درکار تھی۔ تم دوسرے بیٹے کی اپنی دیرینہ خواہش کو نہیں روک پائیں۔ تمہارے ساتھ میں بھی پیار و محبت کے دھارے میں بہتا چلا گیا۔ تمہاری دِلی تمنا کو عملی جامہ پہنانے کے خواب کا حصہ بن گیا۔ لیکن باری تعالیٰ کی عظیم ذات کو یہ منظور نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایک کر چار بیٹیوں نے گھر کے چاروں کونوں کو منور کر دیا۔ پانچ بچوں کی اچھی پرورش اور بہتر تعلیم و تربیت کی ذمہ داریوں کا بوجھ تو کندھوں پر تھا ہی، ان کی شادی اور ضروریات کے پہاڑ کو عبور کرنے کا چیلنج بھی سامنے موجود تھا۔''

اِس سے پہلے کہ نبیلہ کچھ سمجھ یا کہہ پاتی، خالد نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، '' اللہ تبارک وتعالیٰ کا ہم پر بہت بڑا احسان و انعام رہا کہ اُس نے ماجد کو تعلیم مکمل

کرتے ہی نہ صرف باوقار نوکری پر پہنچا دیا، بلکہ ایک اچھے خاندان میں اس کی شادی بھی بروقت ہوگئی۔ تیزی کے ساتھ تبدیل ہوتے معاشرے کے حالات اور جنون کی حد تک بدلتے نظریات کے دَوران جہیز کے بھاری ذخیرے اور چار پہیوں کی گاڑیوں کے ساتھ چاروں بیٹیاں اچھے، پڑھے لکھے اور متمول گھرانوں میں بیاہی گئیں۔''

''اس میں نیا کیا ہے؟ بچوں کے بہتر اور شاندار مستقبل کے لئے سبھی ماں باپ ایسا کرتے ہیں۔ ہم نے بھی مقدور بھر قربانی دی ہے۔ اپنے بچوں کی خوشحال ازدواجی زندگی سے ہم پوری طرح مطمئن ہیں۔ ہمیں اور چاہئے بھی کیا؟؟'' نبیلہ بیچ میں لقمہ دینے سے خود کو نہ روک سکی۔

''یہ بات آئینہ کی طرح صاف اور چمکتے ستاروں کی طرح سچ ہے کہ بچوں کی طرف سے ہم پوری طرح مطمئن اور خوش ہیں، لیکن اس کے باوجود دِل کے ایک گوشہ میں ایک ٹیس بھی ہے، جو بچھو کے ڈنک کی طرح مجھے ستاتی رہتی ہے۔'' خالد نے جملہ پورا کرتے ہوئے گہرا سانس لیا۔

''ٹیس! کیسی ٹیس؟ بتائیے نہ، کیا بات ہے؟ آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں! بتاؤ نہ کیا بات ہے؟'' اسی کے ساتھ نبیلہ کے چہرے پر بے چینی کی لکیریں اُبھر آئیں۔

خالد نے وضاحت کرتے ہوئے کہا، ''نبیلہ! تمہیں شاید علم نہیں کہ ترقی کے جس مقام پر میں آج ہوں، اُسے حاصل کرنے کے لئے جو راہ اختیار کی گئی، اُسے کسی بھی صورت میں ٹھیک نہیں کہا جا سکتا۔ تم ہی بتاؤ، بے ایمانی کی چمک، چوری کی کھنک، جھوٹ کی دھنک، فریب کی مہک اور رشوت کے دلکش بازار سے ہوکر منزلِ مقصود تک جانے والا راستہ کیا جائز ہوسکتا ہے؟''

''آپ کی یہ فلسفیانہ باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔ کوشش کے باوجود میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں کہ آخر آپ کے کہنے کا منشاء کیا ہے؟ اِس طرح کے پُر پیچ الفاظ آپ کی زبان سے پہلے کبھی نہیں نکلے۔ ہاں! میں سچ کہہ رہی ہوں!!'' نبیلہ نے خالد کے چہرے پر اپنی معصوم نگاہیں گڑا دیں۔

"نبیلہ، کیا تم نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت کی کہ ریلوے کے ایک افسر کو ملنے والی ماہانہ تنخواہ میں بچوں کی عمدہ پرورش، بہترین تعلیم، اعلیٰ تربیت اور ماڈرن سطح کی شاندار شادیاں ممکن تھیں؟ نہیں! قطعی نہیں!! یہ سب کرنے کے لئے مجھے اپنے ضمیر کا گلا گھونٹنا پڑا۔ سماج کو کھوکھلا کرنے والے بدعنوانوں کے ہاتھوں خود کو گروی رکھنا پڑا۔" خالد نے یہ کہتے ہوئے خود کو صوفہ کی پشت سے ٹکا دیا۔ نگاہیں کمرے کی چھت پر ٹک گئیں۔ پردۂ سیمیں پر ماضی کے واقعات ایک ایک کر نظروں کے سامنے سے گذرنے لگے۔

تیس برس پہلے، جب خالد نے ریلوے ڈپارٹمنٹ میں بطور اسٹیشن انچارج سروس جوائن کی تھی، تب اُس کے فہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بڑھتی ضروریات کا چشمہ آنکھوں پر لگتے ہی ریلوے ٹریک کی آپس میں کبھی نہ ملنے والی سیدھی پٹریاں، نہ صرف کہیں دور ملتی نظر آئیں گی، بلکہ وقت کی مار سہتے ہوئے خم دار بھی ہو جائیں گی۔ سروس جوائن کئے ایک مہینہ گذر چکا تھا۔ دوسرے مہینہ کی پہلی تاریخ تھی۔ شام کو ڈیوٹی ختم ہونے سے کچھ دیر قبل اسسٹنٹ نے آفس میں آکر ایک لفافہ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ کھلے لفافہ میں روپے دیکھ کر وہ چونک گیا۔ اُس نے وضاحت طلب نظروں سے مسکراتے ہوئے معاون کی جانب دیکھا۔

"اِس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے والے صاحب نے آپ کو اس بابت کچھ بتایا نہیں! صاحب یہ اس کرسی کی اضافی آمدنی ہے۔ ریلوے ڈپارٹمنٹ میں کمائی کے کئی ذرائع ہیں۔ کوئلے اور ڈیزل کی معمولی چوری سے لے کر کئی قسم کے بڑے کارنامے اُوپر انکم سے جڑے ہیں۔ نیچے سے لے کر اُوپر تک کئی افسران اس ریکٹ میں شامل ہیں۔" اتنا کہہ کر معاون کمرے سے باہر نکل گیا۔

خالد ہاتھ میں لفافہ لئے کافی دیر تک سوچتا رہا۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اِس ناجائز رقم کو قبول کرے یا پھر واپس کر دے۔ نئی نوکری۔ پہلا مہینہ۔ فاضل انکم۔ بغیر ہاتھ پیر ہلائے دس ہزار روپیہ کی زائد آمد جہاں کئی گھریلو ضروریات کو پورا کر سکتی ہے، وہیں مہینہ کی تنخواہ کا ایک بڑا حصہ مستقبل کے لئے بچایا بھی جا سکتا ہے۔ روپے

لوٹائے تو اعلیٰ افسر کی ناراضگی اور پھر تبادلہ پر تبادلہ۔لیکن، یہ تو بے ایمانی ہے۔دین اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔نہیں! نہیں!! وہ یہ غلط راستہ نہیں اپنا سکتا۔ اُسے یہ راستہ چھوڑنا ہوگا۔ ہر حال میں چھوڑنا ہوگا۔ حلال روزی کو بے ایمانی کی کمائی سے خراب کرنا کسی بھی شکل میں مناسب نہیں ہے ۔وہ شش و پنج میں کافی دیر تک دیوار گھڑی کے پینڈولم کی طرح کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر ہچکولے کھاتا رہا۔

اور پھر فیصلہ کی گھڑی آگئی۔ تذبذب ختم ہوگیا۔تخیلات کے جنگل میں کھڑا شیطان ایمانداری کے اعصاب پر حاوی ہوگیا۔اُس نے دیکھا کہ بے ایمانی کی نقرئی چادر ڈالنے میں کامیاب، مسکراتا فریبی چہرہ خلاء میں غائب ہوگیا۔ اُس کے وجود پر شیطانی طاقت غالب آچکی تھی۔ خالد اپنی کرسی سے اُٹھا اور حرام کی پہلی کمائی کا لفافہ اپنی پینٹ کی پچھلی جیب میں رکھ کر دفتر سے باہر نکل گیا۔

سیدھے سادے انسان کے اندر گھسی غیر انسانی قوت کے مزید طاقتور ہونے کا سلسلہ جاری رہا۔اِس درمیان کنبہ بڑا ہوتا گیا۔بچوں کی پرورش،تعلیم و تربیت اور اُن کی بر وقت شادی کے فرائض سے سبکدوش ہونے کے بعد کئی برس بڑے سکون سے گذر گئے۔ لفافے آنے کا سلسلہ اَب بھی جاری ہے۔یہ بات الگ کہ وقت کے ساتھ ان کا وزن بڑھ گیا۔

نبیلہ کو صرف روزہ،نماز ،قرآن اور گھر کی ذمہ داریوں سے مطلب تھا۔اُس کے پاس ان سے باہر نکلنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ آخری ایام میں فرصت ملی بھی،تو اس سمت سوچنے کی ضرورت ہی نہیں رہ گئی تھی۔اس نے اپنی ماں کو ناشتہ وکھانا بنانے سے لے کر گھر کی صاف صفائی و دیگر ضروری کام کاج کو بڑے سلیقہ کے ساتھ کرتے دیکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اُس نے نہ صرف شوہر کی خوشی و خدمت کو فوقیت دی، بلکہ حقوق العباد کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بچوں کی بہترین تربیت میں بھی کسی طرح کی کور کسر نہیں چھوڑی۔

خالد نے آج جس طرح کی باتیں کیں،اس طرح کے کلمات ان کی زبان سے

پہلے کبھی نہیں نکلے۔ خالد کبھی چھت کو گھورنے اور کبھی دروازے کی سمت دھیان کر باہر جھانکنے میں مشغول تھے۔ نبیلہ، خالد کی حیران کن کہانی سن کر پریشان تھی۔ خالد جو کہہ رہے ہیں، اگر وہ سچ ہے تو ایسا قطعی نہیں ہونا چاہئے تھا۔ بے ایمانی کی گھی میں تربریانی سے ایمانداری کی روکھی سوکھی روٹی پر یقین رکھنے والی نبیلہ ٹھگی رہ گئی۔ اگر اُسے پہلے یہ معلوم ہو جاتا، تو وہ خالد کو سمجھا بجھا کر غلط راستہ پر جانے سے روک دیتی۔

خالد اپنے خیالات کے سمندر میں پیدا ہوئی بھنور سے باہر نکلنے کی جستجو میں ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ اُس نے خالد کو ماضی کے جھروکوں سے حال کے آنگن میں کھینچ لانے کے لئے زور کی چیخ ماری، ''خالد! یہ تم نے اچھا نہیں کیا! اپنی پاک اور بے داغ زندگی کو داغدار بنالیا۔ تمہیں اپنی آخرت کے بارے میں تو سوچنا چاہئے تھا۔''

نبیلہ تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں قصوروار ہی نہیں، بلکہ گنہگار بھی ہوں۔ لیکن شکر ہے اُس خداوند قدوس کا جس نے مجھے اپنے گناہ کی تلافی کرنے کے لئے ایک موقعہ مرحمت فرمایا۔ تمہیں یاد ہے کہ کئی مہینہ قبل ایک نوجوان ہمارے گھر آیا تھا۔ اُس کی بیوہ ماں بھی اُس کے ساتھ تھی۔ اُس کا باپ ریلوے ڈپاٹمنٹ میں نوکر تھا۔ ڈیوٹی کے دوران ایک حادثہ میں اُس کی موت ہو گئی تھی۔

ہاں!! مجھے یہ تو یاد ہے کہ ایک نوجوان اپنی والدہ کے ساتھ ہمارے یہاں آیا تھا، لیکن اُس کے آنے کی وجہ سے میں بے خبر ہوں۔ اتنا ضرور یاد ہے کہ میں نے اُن دونوں کے لئے کھانا بنایا تھا۔ گھر سے جاتے وقت وہ دونوں کافی خوش دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن آپ کو اس وقت اُن کی یاد کیوں آ گئی؟

نبیلہ!! مجھے یہ قبول کرنے میں کسی طرح کی عار نہیں ہے کہ میں اپنی اس مختصر سی زندگی میں اسلام اور اُس کی تعلیمات سے کسی حد تک دُور رہا، لیکن کسی نہ کسی شکل میں اچھے کام بھی ضرور کئے۔ اپنی انگلیوں پر گنے جا سکنے والے کُل جمع وہ چند کام، جنہیں میں اچھا مانتا ہوں، ضروری نہیں کہ باری تعالیٰ کے یہاں قابلِ قبول بھی ہوں۔ اس کے باوجود اگر میں اپنی جگہ غلط نہیں ہوں تو زندگی میں ایک عمل ایسا ضرور کیا ہے، جسے

بجا طور پر نیک عمل یا نیکی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔رَب نے چاہا تو کل آخرت میں یہ نیک عمل میرے کام آ سکتا ہے، میری بخشش کا سامان ہو سکتا ہے۔

"ٹھیک ہے، آپ پہیلیاں بجھاتے رہئے۔میں تو کچن میں چلی۔مجھے ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔" نبیلہ یہ کہہ کر اُٹھنا ہی چاہتی تھی کہ خالد نے اُسے روکتے ہوئے کہا۔

وہ نوجوان جو اپنی ماں کے ساتھ ہمارے گھر آیا تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد وہ اُن کی عوض محکمہ میں نوکری کرنا چاہتا تھا،لیکن امتحان اور انٹرویو کے زمرے سے گزرے بغیر یہ ممکن نہیں تھا۔پڑھائی لکھائی میں ہوشیار نہیں ہونے کے باوجود اُس نے اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کے امتحان میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔نوجوان یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اُسے امتحان میں کامیاب قرار نہیں دیا جا سکے گا۔لہٰذا اُس نے شارٹ کٹ اپنایا۔کسی طرح یہ جانکاری حاصل کر لی کہ کاپیاں جانچنے کے لئے کس شہر میں کس ممتحن کے پاس گئی ہیں۔

نوجوان نے بنا تمہید اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے صاف گوئی سے کام لیا۔اُس نے بتایا کہ اُس کے باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔بیوہ ماں کے علاوہ اُس کی تین بہنیں ہیں۔تینوں بہنیں زیرِ تعلیم ہیں۔اُنہیں پڑھانے لکھانے کے بعد ان کی شادی نکاح اور گھر کے تمام تر اخراجات اُٹھانے کی ذمہ داری اُسی پر ہے۔اُس کے سینٹر کی کاپیاں چیک ہونے کے لئے اُن کے پاس آئی ہیں۔اگر وہ اُسے امتیازی نمبروں سے پاس کر دیں گے،تو یہ صرف اُس پر ہی نہیں، بلکہ اس کے خاندان پر ایک ایسا احسان ہوگا، جسے تا حیات بھلایا نہیں جا سکے گا۔اُس نے اپنے ہینڈ بیگ سے بیس ہزار روپیہ کی گڈّی نکالی اور ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ وہ صرف اتنے ہی روپیوں کا انتظام کر پایا ہے۔برائے کرم اِنہیں قبول کر لیں۔

"بیوہ کے معصوم نوجوان بیٹے کی درد بھری داستان اور کنبہ کے لئے اُس کی ضرورت و اہمیت نے میرے ذہن و قلب میں بھونچال پیدا کر دیا۔میں اندر دوسرے کمرے میں گیا اور کاپیوں کا بنڈل اُٹھا کر اُس کے سامنے ڈال دیا۔اُس سے اپنی کاپی

نکالنے کو کہا۔اُسی بنڈل سے میں نے ایک خوشخط ، عمدہ مواد اور صحیح جوابات کی کاپی نکال کر اُسے نقل کرنے کو دے دی۔ بیس ہزار روپۓ کی رقم یہ کہہ کر لوٹا دی کہ اِنہیں اپنی بہنوں کی شادی میں خرچ کرنے کے لئے ڈاک خانہ کے فکس ڈپازٹ میں ڈال دے۔نوجوان نے اصرار بھی کیا،لیکن میرے انکار پر اُس نے روپے بیگ میں واپس رکھ لئے۔نوجوان نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے کام کو انجام دیا۔کام سے فراغتی پر اُنہیں اصرار کر کے کھانا کھلوایا۔اس کے بعد ماں بیٹا شکریہ ادا کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔''اتنا کہہ کر خالد نے گہری سانس لی۔

نبیلہ!اُس نوجوان کو اے ایس ایم کی نوکری مل گئی ہے۔نوکری جوائن کرنے کے بعد وہ آج اسٹیشن پر آیا تھا۔ مٹھائی کے ڈبّہ کے ساتھ۔نوکری کی خوشی اُس کے چہرے پر روزِ روشن کی طرح عیاں تھی۔بات بھی خوشی کی تھی۔میں نے مبارک باد کے ساتھ اُسے اس کے خوشحال مستقبل کی دُعائیں بھی دیں۔

''اچھا! تو یہ ہے آپ کا وہ نیک عمل، جسے بتانے کے لئے آپ نے اتنا وقت لگا دیا۔ مجھے لگتا ہے کہ اس عمل نے آپ کو بہت حد تک سکون ہی نہیں پہنچایا، بلکہ مکمل طور پر مطمئن اور ہشاش و بشاش بھی کر دیا ہے۔ مبارک ہو! اللہ آپ کے اس نیک عمل کو بے حد بے حد قبول فرمائے اور نجات کا ذریعہ بنائے۔''زبان سے ان کلمات کو ادا کرنے کے ساتھ نبیلہ اُٹھی اور چہرے پر مسکان لئے کچن میں چلی گئی۔خالد نے خوشی میں آنکھیں بند کر لیں۔

نبیلہ یوں تو خالد کے سامنے بڑی خوش دلی سے اپنے جذبات کا اظہار کر آئی تھی،لیکن وہ خود کو یہ جملہ کہنے سے بھی باز نہیں رکھ سکی کہ اگر کسی نوجوان کو نقل کرا کر پاس کرنے کا ناجائز عمل نیک عمل ہے،تو پھر بُرا عمل کیا ہے؟؟

○○

(مئی ۲۰۱۷ء)

نوکرانی

دارالخلافہ کے قریب واقع نئی طرز کے شہر میں جہاں آسمان چھونے کی ناکام سعی کرنے والی عالی شان بلڈنگیں ہیں، وہیں پچاس ساٹھ گھروں پر مشتمل ایک ایسی بستی بھی ہے جس کی پہچان دُور سے ہو جاتی ہے۔ اس سمت سے گزرنے والے لوگوں کو کافی پہلے ہی سے بدبو اور تعفن کا احساس ہونے لگتا ہے۔ کچھ افراد، خاص کر عورتیں تو ناک پر رُومال رکھ کر گزرتی ہے۔ بناوٹ اور تعمیر کے اعتبار سے قریب قریب ایک جیسے دکھائی پڑنے والے گھروں میں جھُگی، جھونپڑی، ٹن شیڈ یا ایک کمرے پر مشتمل معمولی قسم کے کچے کمرے تو دکھائی دیتے ہیں، لیکن پوری جھونپڑ پٹی میں ایک بھی مکان پختہ نہیں ہے۔ بے حد غریبی میں زندگی کا بوجھ ڈھونے والے ان لوگوں کے پاس سر چھپانے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بستی کے لوگوں کو کھلے عام دھوپ برداشت کرنے اور بارش کے موسم میں بھیگنے کی عادت پڑ گئی ہے۔

کئی دہائی قبل گاؤں و دیہات میں دو وقت کی روٹی کے لئے پریشان کئی کنبے کام کاج کی تلاش میں مع اہل و عیال شہر میں آ گئے تھے۔ کھانے کو روٹی اور رہنے کو ٹھکانہ نہیں تھا۔ کام کاج کی تلاش کے ساتھ خالی پڑی افتادہ جگہ میں عارضی جھگیاں ڈالی گئیں۔ برسوں سے رہ رہے ان لوگوں کے پاس اپنے شناختی کارڈ کے علاوہ آدھار کارڈ بھی ہیں، لیکن مستقل روزگار نہیں ہے۔ ان میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی ہے۔ اِنہیں کے بیچ کئی کنبے ہندوؤں کے بھی آباد ہیں۔ مسائل سب کے ایک جیسے ہیں

۔ یکسانیت کا یہ عالم ہے کہ بھوک افلاس سے دوچار گھروں میں کھانے پینے کا کوئی انتظام ہو یا نہ ہو، لیکن ہر گھر میں تین چار بچے ضرور مل جائیں گے۔ کسی گھر کا کوئی بچہ شاید ہی کبھی پورے لباس میں نظر آئے۔ ان کی عید اور دیوالی بھی آدھے اُدھورے کپڑوں میں گزر جاتی ہے۔

بستی کے کئی مرد نئے مکانوں کی تعمیر یا پُرانے گھروں کی مرمّت کا کام کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اِن معماروں کے پاس دِن بھر مزدوری کر شام کو بچوں کے لئے بغیر سبزی کی روٹی کا جگاڑ کرتے ہیں ۔ چند لوگ شہر کی دُکانوں پر چھوٹی موٹی نوکری کرتے ہیں۔ بستی میں ایسے کام چور مرد بھی ہیں، جو خود کام نہیں کرتے، بلکہ اُن کا انحصار اپنی عورتوں کی کمائی پر ہے۔ عورتوں کو گھر کا خرچ چلانے کے لئے شہر کے بڑے لوگوں کے یہاں بطور خادمہ کام کرنا پڑتا ہے۔ ان گھروں میں غریب عورت کی رسائی آسان نہیں ہے۔ نوکری حاصل کرنے کے لئے آدھار کارڈ اور کسی پہچان کے شخص کی ضمانت درکار ہوتی ہے۔

نہال اور جگدیش کے گھر آمنے سامنے ہیں۔ جگدیش کے گھر میں بیوی انیتا کے علاوہ کامنا اور دیپک نام کے دو بچّے بھی ہیں۔ جگدیش شہر میں کسی بنئے کے یہاں پرچون کی دُکان پر کام کرتا ہے۔ وہ روزانہ صبح سویرے دوپہر کا کھانا باندھ کر کام پر چلا جاتا ہے۔ واپسی دِن چھپے ہوتی۔ کبھی کبھی رات بھی ہو جاتی ہے۔ بیڑی پینے کے علاوہ اُس میں کوئی دوسری لت نہیں ہے۔

حالانکہ جگدیش کو ہر مہینہ تنخواہ میں اتنے روپے مل جاتے ہیں کہ گھر کا خرچ اُٹھانے کے بعد بیس پچیس روپے کی بچت ہو جاتی ہے، لیکن انیتا اتنے پر مطمئن نہیں ہے۔ وہ بستی کی درجنوں خادماؤں کے ساتھ علی الصبح شہر جاتی ہے۔ اُسے جس گھر میں نوکری ملی ہے، اُس گھر کا مالک اور مالکن دونوں دفتروں میں کام کرتے ہیں۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اُس کا پہلا کام صاف صفائی اور ڈبل بیڈس کی چادریں بدلنا رہتا ہے۔ اس کے بعد کچن میں داخل ہو جاتی ہے۔ سِنک میں پڑے رات

بھر کے جھوٹے برتنوں کو دھوتی ہے۔ پھر اُنہیں خشک کر اسٹینڈ میں لگاتی ہے۔اس کے بعد مالک، مالکن اور ان کے دونوں بچّوں کے لئے ناشتہ بناتی ہے۔ ناشتہ تیار ہونے کے بعد اُسے میز پر لگاتی ہے۔اس درمیان گھر کے بھی افراد نہانے کے عمل سے فراغت پا کر کھانے کی میز پر آجاتے ہیں۔اِدھر اہلِ خانہ ناشتہ کرتے ہوتے ہیں،اُدھر وہ دوپہر کا کھانا ان کے لنچ باکسوں میں رکھ دیتی ہے۔مالک کی ماں دھارمِک مہیلا ہے۔ بغیر پوجا پاٹھ کے ایک دانا بھی منہ میں نہیں ڈالتی ۔وہ پوجا سے فارغ ہو کر ہی ناشتہ کرتی ہیں۔

انیتا اس دَوران بھی خالی نہیں بیٹھتی۔وہ کمرے سے واشنگ مشین نکال کر باہر لے آتی ہے۔دیوار میں نسب پانی کی ٹونٹی سے پائپ جوڑ کر مشین میں پانی بھرتی ہے ۔پھر اندازے سے کئی چمچ واشنگ پاوڈر مشین میں ڈال کر اُسے آن کرتی ہے۔پاوڈر کے پانی میں گھلنے کے بعد پہلے سفید کپڑے دھوتی ہے۔ بعد میں رنگین کپڑوں کی دُھلائی کی جاتی ہے۔سفید کپڑے پہلے دھونے سے اُن پر رنگین کپڑوں کا رنگ نہیں لگتا ۔صاف پانی اور نئے پاوڈر میں دُھلے سفید کپڑوں کی چمک الگ ہی دکھائی دیتی ہے۔گیلے کپڑے مشین کے دوسرے خانے میں ڈال کر سُکھاتی ہے ۔غرض کپڑوں کو دھونا،سُکھانا، کچھ دیر سائے میں پھیلانا اور پھر پریس کر اُنہیں الماری میں رکھنا اُس کا روزمرہ کا کام ہے۔

عام طور پر انیتا قریب گیارہ بجے کام سے فراغت پا کر اپنا ناشتہ کھانا لئے گھر لوٹ آتی ہے ۔ایسا کرنے سے اُسے اپنے گھر دوپہر کا کھانا بنانا نہیں پڑتا۔وہ کچھ دیر کے لئے چارپائی پر لیٹ کر آرام کرنے کے علاوہ اسکول گئے بچوں کی واپسی کا انتظار کرتی ہے۔بچوں کے گھر میں قدم رکھتے ہی وہ خوشی خوشی کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرتی ہے۔بچّے اپنی پیٹھ سے بستہ اُتار کر میز پر رکھتے ہیں۔پھر بستی میں لگے سرکاری نل پر نہا دھو کر کپڑے تبدیل کرتے ہیں۔اتنی دیر میں وہ ان کے لئے کھانا لگاتی ہے اور خود بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانے میں شریک ہو جاتی۔

انیتا اپنی ازدواجی زندگی سے کافی مطمئن تھی، لیکن سامنے کے گھر میں رہنے والی سیما اپنی گھریلو زندگی سے خوش نہیں تھی۔ نہال کسی دِن مزدوری پر چلا جاتا، تو کئی کئی روز ناغہ کرتا۔ گھر میں ہمہ وقت ہر چیز کی تنگی رہتی۔ میاں بیوی کے علاوہ پانچ بچّے تھے۔ غُربت کا یہ عالم تھا کہ بچّوں کو کھانا کھلانے کے بعد نہال اور سیما کے لئے کھانا کم رہ جاتا تھا۔ اُنہیں پیٹ بھر کھانا کھائے کئی کئی دِن ہو جاتے۔ پہننے اوڑھنے کے کپڑے بھی معمولی ہوتے۔ اِنہیں ہر ہفتہ سڑک کے کنارے لگنے والے بازار کی پھڑ سے خریدا جاتا۔ عید کے موقع پر نئے کپڑے اتفاق سے ہی نصیب ہوتے۔ صبر و شکر کے ساتھ زندگی کی گاڑی گھسٹ تو رہی تھی، لیکن حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ آخر کار اُس نے بھی انیتا کی طرح کسی بڑے گھر میں نوکری کرنے کا ارادہ کر لیا۔

انیتا اپنے کام سے فراغت پا کر گھر آ گئی تھی، لیکن ابھی بچّے اسکول سے نہیں لوٹے تھے۔ سیما نے موقع کو غنیمت جانا اور انیتا سے ملنے اُس کے گھر چلی گئی۔ انیتا، سیما کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اُس کی خیریت معلوم کی۔ سیما نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے سیدھے سیدھے اپنی پریشانی انیتا کے سامنے رکھ دی اور اُس سے کسی ٹھیک ٹھاک گھر میں صاف صفائی کا کام دِلانے کی درخواست کی۔

انیتا نے سیما کی بات غور سے سُنی۔ اُس نے پریشانی کی ایک وجہ بڑے پریوار کو بتاتے ہوئے اِس پر قدغن لگانے کا مشورہ دیا۔ سیما شرم سے زمین میں گڑ گئی۔ اُس نے سر اُوپر اُٹھایا، انیتا کی جانب دیکھا اور بڑے اعتماد کے ساتھ کہا، ''بہت ہو چُکا۔ بس اَب اور نہیں! یقین مانیئے، بالکل نہیں!!''

''ہاں! اَب بالکل نہیں!!'' سیما کے فیصلہ سے انیتا کا چہرہ کھِل اُٹھا۔ اُس نے سیما کو ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ اُمید جتائی کہ ایک دو روز میں کام مِل ہی جائے گا۔ سیما نے انیتا کا شکریہ ادا کیا اور گھر واپس آ گئی۔

چار دِن بعد سیما بھی ماسٹر رمیش کے گھر کام پر جانے لگی۔ وہ چھوٹے بیٹے کو گھر پر ہی چھوڑ جاتی۔ اُس کے آنے تک نہال بچّے کی دیکھ بھال کرتا۔ اگر نہال کو کہیں

جانا ہوتا، تو بڑی بیٹی چھوٹے بھائی کا دھیان رکھتی۔ سیما کو ماسٹر میش کے گھر کام کرتے ہوئے آٹھ مہینے بیت گئے۔ مالک یا مالکن کو اُس سے کسی طرح کی شکایت نہیں ہوئی۔ رفتہ رفتہ اُس کی حیثیت گھریلو ممبر کی سی ہوگئی۔

ایک روز کپڑے دھوتے ہوئے سیما کو ماسٹر جی کی پینٹ میں کچھ روپے ملے۔ روپے ٹکٹ پاکٹ میں رکھے تھے۔ اُس نے روپے مالکن کے حوالے کر دیے۔ مالکن سیما کی ایمانداری پر حیران رہ گئی۔ اُس نے پانچ ہزار روپے لوٹانے پر سیما کا شکریہ ادا کیا۔ جب ماسٹر جی اسکول سے لوٹے، تب کِرَن نے اُن کی جیب سے نکلے روپیوں کا تذکرہ کیا۔

ماسٹر میش بولے، ''ارے ہاں! جیب میں پانچ ہزار روپے تھے۔ دو نوٹ دو دو ہزار اور دو پانچ پانچ سو کے۔''

''جی ہاں، پانچ ہزار! یہ نوٹ سیما کو اُس وقت ملے تھے، جب وہ جیبوں کی تلاشی کے بعد کپڑے مشین میں ڈال رہی تھی۔ ہماری نوکرانی نیک اور ایمان دار ہے، ورنہ اس طرح نکلے روپے اکثر نوکر غائب کر دیتے ہیں۔'' کِرَن نے کہا۔

''اِس کی ایمانداری تو اُسی روز ثابت ہوگئی تھی، جب اُس نے کام پر آتے ہوئے باہری دروازے میں گر گیا میرا پرس تمہیں لا کر دے دیا تھا۔ تب تو اُس نے پرس کھول کر بھی دیکھا تھا۔ اُس میں 20 ہزار روپے تھے۔ سیما کی جگہ کوئی دوسری ہوتی، تو پرس لے کر غائب ہوگئی ہوتی۔ تم نے تو اُس سے کہا بھی تھا کہ اگر وہ پرس نہ لوٹاتی تو ہمیں کیا پتہ چلتا۔ ہم تو یہی سوچتے کہ پتہ نہیں کہاں گرا ہے۔'' ماسٹر میش نے سیما کی ایمانداری پر تصدیقی مہر ثبت کرتے ہوئے اپنی بات پوری کی۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ وہ واقعی نیک اور صالحہ ہے۔ اُس دن میں نے بیس ہزار روپے میں سے ایک ہزار روپے بطور انعام دینے چاہیں، مگر اُس نے قبول نہیں کیے۔ اُس نے صاف کہا، اگر وہ چاہتی تو بٹوے کے سارے روپے رکھ سکتی تھی، لیکن وہ اُس خاندان کی بیٹی ہے، جس میں سکھایا جاتا ہے کہ ایمانداری کی ایک روٹی بے ایمانی

کی ڈھیر ساری روٹیوں سے بہتر ہے۔'' کرَن نے کہا۔

ایک دن انیتا نے ماسٹر رمیش کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے سیما کو آواز دی۔ ماسٹرنی جی کمرے سے نکل کر آئیں۔ اُنہوں نے بتایا کہ سیما کام ختم کر گھر جا چکی ہے۔ ''انیتا تمہارا بہت بہت شکریہ!''

''کس بات کا شکریہ ماسٹرنی جی؟ کیا ہوا، جو اتنا خوش ہیں؟'' انیتا نے سوال کیا۔

''بات ہی خوشی کی ہے۔ تم نے جس نوکرانی کا انتظام ہمارے لئے کیا ہے، وہ بہت شریف، نیک اور ایماندار ہے۔'' کرَن نے کہا۔

''کیا ہوا؟ ذرا ہم بھی تو سنیں!!'' انیتا نے پوچھا۔

''ایک روز گھر میں قدم رکھتے وقت سیما کو دروازے میں ماسٹر جی کا پرَس پڑا ملا تھا۔ اُس میں 20 ہزار روپے تھے۔ روپے دیکھنے کے باوجود اُس نے بٹوا میرے حوالے کر دیا تھا۔ آج کپڑے دھوتے وقت ماسٹر جی کی جیب سے پانچ ہزار روپے نکلے اور اُس نے روپے اُسی حالت میں میرے ہاتھ پر لا رکھے۔ اِس سے پہلے کسی نوکرانی نے نہ تو اِس طرح ہمیں کبھی روپے لاکر دئے اور نہ کہیں گری پڑی چیز ہی اُٹھا کر دی! کئی بار روپے اور چیزیں غائب ہوئیں، لیکن مجال جو کسی نے کچھ لوٹایا ہو۔ سیما اچھی نوکرانی ہے۔'' ماسٹرنی نے سیما کی تعریف کی۔

''کوئی بھی مسلمان اگر اپنے دین پر چلتا ہے، تا وہ یقیناً ایماندار ہی ہوتا ہے۔ سیما غریب ضرور ہے، لیکن خوددار اور دیانت دار ہے۔ گھر میں کتنی ہی پریشانی کیوں نہ ہو، مگر معمولی چیز کے لئے بھی نہ تو سوال کرتی ہے اور نہ ہی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتی ہے۔....'' انیتا نے اُس کی خوبیاں گنانی شروع کر دیں۔

''تو کیا سیما مسلمان ہے؟ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ وہ ہندو ہے۔ ہندوؤں میں سیما نام کافی پائے جاتے ہیں۔؟'' ماسٹرنی جی نے حیرت زدہ نظروں سے انیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’جی ہاں! سیما مسلمان ہے!!‘‘ انیتا نے مختصر جواب دیا۔
’’اگر تم پہلے بتا دیتیں، تو شاید ہم سیما کو اپنے یہاں کام نہ دیتے، مگر خیر! نہ بتا کر تم نے اچھا ہی کیا۔‘‘ ماسٹرنی کے دِل کی بات زبان پر آگئی۔
’’مگر کیوں.......؟‘‘ انیتا نے سوال کیا۔
’’وہ اس لئے کہ مسلمان ٹھیک نہیں ہیں۔ زیادہ تر کا رویہ بہت خراب ہے۔ ایک تو یہ جھوٹ بہت بولتے ہیں۔ دوسرے جھوٹی سچی قسمیں کھانے میں دیر نہیں لگاتے۔ تیسرے اُدھار یا قرض کی آسانی سے واپسی نہیں کرتے۔ چوتھے پوری اُجرت لے کر بھی کام خراب اور اَدھورا کرتے ہیں۔ پانچویں پولیس رکارڈ میں موجود چور، بد معاش، جواری، اُچکّے، مغوی، قاتل، زانی، فریبی، دھوکے باز، جعلساز، غاصب، لُٹیرے اور دہشت گردوں میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی ہوتی ہے۔‘‘ ماسٹرنی جی نے اپنے قلب کے کسی گوشے میں چھپی مسلموں کے تیئں اپنی نفرت اور حقارت کو ایک ہی سانس میں اُلٹ کر دم لیا۔
’’آپ کی بات کسی حد تک صحیح ہو سکتی ہے، لیکن سارے مسلمان ایک جیسے نہیں ہوتے۔ خراب لوگ تو ہندوؤں میں بھی ہوتے ہیں۔ سیما اُن لوگوں میں سے بالکل نہیں ہے۔ وہ نہایت شریف، دیندار اور پکّی سچّی مسلمان ہے۔ میرا یقین ہے کہ اس سے آپ کو کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میرے گھر کے ٹھیک سامنے رہتی ہے۔ بستی میں اور بھی مسلمان ہیں، لیکن سیما کی بات ہی الگ ہے۔ برسوں سے جانتی ہوں اِسے۔‘‘ انیتا نے اپنی بات پوری کی اور ماسٹرنی جی سے اجازت لے کر گھر سے باہر آگئی۔
’’چلئے! ہمیں سیما کے مسلمان ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ کام بڑی صفائی سے کرتی ہے۔ ایماندار بھی ہے اور ہمیں کیا چاہئے؟ اس سے قبل تو جتنی بھی نوکرانیاں ملیں، سب ہاتھ چلک، کام چور اور مکر و فریب کا مجسمہ تھیں۔‘‘ مالکن نے خود کو تسلّی دی۔
روپے لوٹانے کے واقعہ کے بعد سے سیما کی وقعت اس گھر میں اور بڑھ گئی

تھی۔ ماسٹر جی کو بھی اس کا علم ہونا ہی تھا۔ اُنہوں نے صاف کہا کہ ہمیں اس کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمیں اپنے کام سے کام اور اُسے اپنی تنخواہ سے مطلب۔

وقت کا پرندہ تیز اُڑان پر تھا۔ اسی دَوران ایک روز کِرَن کی ماتا جی بیٹی کے یہاں کچھ دِن رہنے کے ارادے سے تشریف لے آئیں۔ اُنہوں نے محسوس کیا کہ نوکرانی ہر کام شروع کرنے سے پہلے کچھ بُد بُداتی ہے۔ شاید بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتی ہے۔ وہ کرسی سے اُٹھیں اور کمرے میں داخل ہو کر بیٹی سے بولیں، ''بیٹی کرن! تیری نوکرانی تو پرتییک کاریہ آرمبھ کرنے سے پوروِ کچھ اَیسے شبدوں کا اُچّارن کرتی ہے، جو صرف مسلمانوں کے مُکھ سے سُنے جاتے ہیں۔ یہ تو مجھے مسلمان لگے ہے۔''

''ہاں ماں! سیما مسلمان ہے۔ بہت نیک، ایماندار اور بھروسہ کی عورت۔'' کرن نے ماں سے سیما کی تعریف کی۔

''اگر مجھے پتہ ہوتا کہ تُو نے گرِہ کاریہ کے لئے دھرم بھرشٹ کرنے والی نوکرانی رکھ لی ہے، تو میں تیرے گھر کداپی پدارپن نہ کرتی۔'' ماں جی نے اپنے من کی بات کہہ دی۔

''ماں پڑھے لکھے لوگوں کو دھرم، جات، اُونچ نیچ اور چھوا چھوت کا بھید نہیں کرنا چاہئے۔ سب اُس ایک مالک کے بنائے بندے ہیں۔ وہ آپ کو بھی مسلمان کے گھر پیدا کر دیتا، تو آپ کیا کرتیں؟'' کرن نے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''خیر تُو جانے، تیرا کام جانے، میں تو اِس کے ہاتھ کا چُھوا کچھ بھی گرہن نہیں کروں گی۔ کہے دیتی ہوں، ہاں!'' اِسی کے ساتھ ماں جی ہونٹ پچکاتی ہوئی کرسی پر جا بیٹھیں۔

ماں جی کو آئے ابھی ایک ہفتہ ہی ہوا تھا۔ اتوار کے روز کِرَن کا بھائی جے دیو آ گیا۔ اُس نے ماں جی، بہن، بہنوئی اور بھانجے اور بھانجی کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا۔ کچھ دیر آرام کیا اور پھر کسی کو بتائے بغیر گھر لوٹ گیا۔ قریب چار بجے سو کر اُٹھی

ماں جی کی نگاہ ہُک میں لٹکے اپنے بیگ پر پڑی۔ بیگ کی زِپ کُھلی تھی۔ وہ گھبرا گئیں اور جلدی سے اٹھ کر بیگ کھول کر دیکھا۔ بیگ میں رکھے 15 ہزار روپے غائب تھے۔ اُن کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ اُنہوں بیٹی اور داماد کو پُکارتے ہوئے گھر سر پر اُٹھالیا۔ کرن اور رمیش بھی دَوڑے دَوڑے آئے۔ ''کیا ہوا ماں جی؟ کیا ہوا ہے؟''

''میں لُٹ گئی۔ برباد ہو گئی۔ میری برسوں کی کمائی چلی گئی۔ 15 ہزار روپے جیسے تیسے جوڑے تھے۔ سب چُرا لئے کمبخت نے۔ میں اُسے نہیں چھوڑوں گی۔ رپورٹ لکھاؤں گی۔ پولیس سب پتہ لگالے گی۔'' ماں جی اپنے نقصان پر بہت دُکھی تھیں۔

''کس نے نکالے آپ کے روپے؟ کون ہوسکتا ہے وہ؟'' کرن نے پوچھا۔

''ماں جی، کس نے چُرا لئے، آپ کے روپے؟ کسی پر شک ہے آپ کو؟'' رمیش نے معلوم کیا۔

''شک ہی نہیں! پورا یقین ہے۔ اُس مسلٹی نوکرانی کے علاوہ کوئی نہیں چُرا سکتا میرے روپے۔'' ماں نے سیدھا الزام سیما پر لگا دیا۔

''آپ کو دھوکا ہوا ہے ماں جی۔ سیما ایسا نہیں کر سکتی۔ وہ بہت شریف اور بھروسے پر کھری اُترنے والی دیندار عورت ہے۔'' کرن نے کہا۔

''اچھا نوکرانی تو بھروسے کی ہوگئی! اور ماں!! جس نے تجھے نو مہینے پیٹ میں رکھا۔ خود گیلے میں لیٹ کر تجھے سوکھے میں سُلایا۔ پال پوس کر بڑا کیا، پڑھا لکھا کر کسی قابل بنایا اور تیرا وِواہ کر اِس گھر میں پہنچایا، وہ ماں بے بھروسے کی ہو گئی۔ پچھتائی میں تیرے گھر آکر۔ نہ آتی تو اچھا تھا۔ کم سے کم..... ٹھیک ہے میں صبح ہوتے ہی اپنے گھر چلی جاؤں گی۔ تو اِس گھر میں مسلٹی کو رکھ۔'' اتنا کہہ کر ماں جی خاموش ہو گئیں۔

رمیش نے کہا، ''ماں جی آپ فکر نہ کریں۔ آپ کے روپے مِل جائیں گے۔ یہیں کہیں ہوں گے۔ کل کو جب سیما آئے گی، تو اُس سے بھی معلوم کرلیں گے۔''

''اُس سے معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ایسا کیوں کرے گی، جو عورت 20 ہزار روپے دروازے سے اُٹھا کر اور کپڑے دھوتے وقت پینٹ سے نکلے

پانچ ہزار روپے لوٹا سکتی ہے، وہ ایسا کر ہی نہیں سکتی۔ ہم اُس سے نہیں پوچھیں گے۔ اگر اِس میں اُس کا کوئی ہاتھ ہوگا، تو وہ خود ہی بتا دے گی۔'' کرن نے ایک طرح سے بات ختم کردی۔

اگلے دِن کام پر آئی سیما سے ماسٹر رمیش اور ماں جی نے الگ الگ معلومات کی، مگر اُس نے روپیوں کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی۔ کِرَن کے نوکرانی سے پوچھ تاچھ نہ کرنے پر ماں جی ناراض ہوگئیں۔ وہ گھر جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئیں، تو ماسٹر جی کو غصہ آگیا۔ اُنہوں نے سیما سے سخت لہجہ میں پوچھا، ''سچ سچ بتاؤ سیما! نہیں تو ہم تمہارے خلاف پولیس کیس کریں گے۔''

''مالک آپ بڑے لوگ ہیں۔ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اتوار کی تعطیل کے سبب آپ تو گھر پر ہی موجود تھے۔ میں آپ کے سامنے ہی کھانا ٹیبل پر لگا کر اپنے گھر چلی گئی تھی۔ مجھے تو یہ بھی علم نہیں کہ روپے رکھے کہاں تھے؟ آپ ہی سوچئے، میں روپے کیوں چُراؤں گی؟ مجھے ضرورت ہوتی تو آپ سے یا مالکن جی سے کہہ کر اُدھار لے سکتی تھی۔ خدا کے واسطے مجھ پر ایسا الزام مت لگایئے۔.....'' اتنا کہتے کہتے سیما رونے لگی۔

کِرَن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ ماں جی نے سیما کو خوب بُرا بھلا کہا اور اُسے گھسیٹتے ہوئے کمرے میں بند کر دیا۔ سیما اپنی بے گناہی کا ثبوت دیتی رہی، روتی رہی مگر ایک بیکس و مجبور کی کمزور سسکیاں کمرے میں ہی دَم توڑتی رہیں۔

سیما کے شام تک گھر نہیں پہنچنے پر نہال نے سمجھا کہ گھر پر کام زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ وہیں رُک گئی ہے۔ صبح آ جائے گی، لیکن جب وہ صبح کو بھی نہیں آئی، تب نہال نے ماسٹر جی کے گھر جا کر معلوم کیا۔ دروازے پر آئی بوڑھی عورت نے کہا، ''وہ تو شام سے پہلے ہی گھر چلی گئی تھی۔''

یہ سن کر نہال گھبرا گیا۔ اُس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اُس نے بستی کے

لوگوں کو اِکٹھا کیا اور سیما کے گھر نہیں لوٹنے کی بات اُن کے سامنے رکھی۔ بستی والے جمع ہو کر ماسٹر جی کے مکان پر پہنچے اور ہنگامہ کرنے لگے۔ رمیش اپنے گھر کے سامنے بستی والوں کو احتجاج اور ہنگامہ کرتے دیکھ گھبرا گیا۔ اُس نے کمرے میں بند سیما کو باہر نکال کر گھر جانے کے لئے کہا۔

سیما خاموشی کے ساتھ گھر سے باہر آ گئی۔ سیما کو گھر سے نکلتے دیکھ کر بستی والوں کا غُصّہ اور بڑھ گیا۔ انہوں نے ماسٹر کے خلاف جم کر نعرے بازی کی۔ سیما نے آ کر اُنہیں ہنگامہ کرنے سے روکا اور چوری کے الزام میں کمرے میں بند کرنے کی تفصیل سے آگاہ کیا۔

یہ سُنتے ہی انیتا آگ بگولہ ہو گئی اور ماسٹر جی کے گھر کی طرف لپکی، مگر سیما نے اُسے روک لیا اور سب لوگوں کو بستی میں واپس لے آئی۔ سیما کا کام پر جانا بند ہو گیا۔ چوری کے الزام کے بعد وہ خاموش اور بجھی بجھی سی رہنے لگی۔

ماسٹر رمیش نے بلڈنگ والوں کو اپنے گھر دعوت پر بلایا اور اُنہیں بتایا کہ مسلم بستی میں رہنے والے گندے لوگ بنگلہ دیشی ہیں اور دیش مخالف سازشوں میں ملوث رہتے ہیں۔ اِنہیں یہاں سے ہٹانے کے لئے مہم چھیڑنے کی ضرورت ہے۔ گھروں میں کام کرنے والی بستی کی عورتیں اکثر چوری کرتی ہیں۔ ہماری نوکرانی نے 15 ہزار روپے چوری کر لئے۔ ہم نے اُسے ہٹا دیا ہے۔ یہ لوگ بھروسے کے نہیں ہیں۔ اِن سے دُور رہنا چاہئے۔ لوگوں نے ماسٹر رمیش کی بات بڑے غور سے سُنی اور اُن کی رائے کو تسلیم کر لیا۔ اُنہوں نے بستی والوں کے خلاف کی جانے والی کارروائی کو حتمی شکل دینے پر اتفاق کے ساتھ ماسٹر رمیش کو اپنا قائد چن لیا۔

چار دِن بعد رمیش، بچّے، کرَن اور ماتا جی ٹیبل پر ناشتہ کر رہے تھے۔ اِسی دوران جے دیو اندر داخل ہوا اور ہاتھ کا لفافہ میز پر رکھتے ہوئے بغیر ہاتھ منہ دھوئے اُن کے ساتھ ناشتہ میں شامل ہو گیا۔

ناشتہ کے بعد ماں نے پُوچھا، ''لفافہ میں کیا ہے، بیٹا؟''

’’کچھ نہیں.....! آپ کے روپے ہیں۔ لوٹانے آیا ہوں۔ آپ کے بیگ سے لے گیا تھا۔ پوچھے بغیر !! معاف کرنا، ماں جی !ذرا جلدی میں تھا۔ سب سو رہے تھے۔ ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔‘‘ جے دیو نے لفافے سے روپے نکالتے ہوئے کہا۔

’’کیا.......؟، تو لے گیا تھا میرے روپے! میرے روپیوں سے پھر جوا کھیل آیا، تو!!۔‘‘ ماں نے بیٹے کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ماسٹر رمیش نے ,کرَن پر نگاہ ڈالی اور پھر کچھ سوچتے ہوئے چھت کی طرف دیکھنے لگا۔

,کرَن کے چہرے پر زبردست غُصّہ تھا۔ وہ خاموشی سے اُٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

جے دیو نے روپے ماں کی طرف بڑھا دئے، مگر اِن روپیوں کے لئے ہاتھ نچا نچا کر ہنگامہ کرنے والی ماں کے ہاتھ نہیں اُٹھ سکے۔ وہ شل ہو چکے تھے۔ ماسٹر رمیش قدرت کے اس عبرت ناک انتقام پر ہکّا بکّا تھے۔

○○
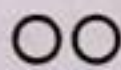
(فروری ۲۰۱۸ء)

تطہیر

ڈیوٹی ختم ہوچکی تھی۔ڈاکٹرنوید اپنی سیٹ سے اُٹھا اور کیبن سے باہر نکل آگیا۔ برآمدے میں ڈاکٹرزیبا دکھائی نہیں دی ۔ شاید! وہ کسی مریض کا چیک اَپ کر رہی ہو۔یہی سوچ کروہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا اُس کے کیبن کے سامنے پہنچا اور انتظار کرنے لگا۔کافی دیر تک بھی جب کوئی مریض کیبن سے باہر نہیں نکلا،تب اُس نے اندر جانے کا فیصلہ کیا۔کیبن میں کوئی مریض نہیں تھا۔زیبا اکیلی بیٹھی تھی۔ڈیوٹی ختم ہونے اور مریض کے موجود نہ ہونے کے باوجود اُس کا کیبن میں بیٹھے رہنا سمجھ سے باہر تھا۔وہ کرسی کی پُشت پر سرٹکائے لگاتار چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ایسا لگتا تھا، جیسے کسی گہری سوچ میں ہے۔اُسے ڈاکٹر نوید کے کیبن میں داخل ہونے تک کا علم نہیں ہوا۔

’’کیا بات ہے زیبا؟ڈیوٹی ختم ہوگئی اورتم ابھی تک یہیں بیٹھی ہو!خیریت تو ہے!!‘‘ڈاکٹرنوید نے دریافت کیا۔

ڈاکٹرنوید کی آواز سن کرزیبا چونک گئی۔اس کی زبان سے نکلا،’’ارے آپ !بس یوں ہی!!آؤ چلیں!!!‘‘

زیبا نے اپناہینڈ بیگ اُٹھایا اور نوید کے ساتھ کیبن سے باہر نکل گئی۔دونوں ساتھ ساتھ اسپتال سے باہر آئے اور کار میں بیٹھ گئے۔نوید نے گاڑی اسٹارٹ کی اور کارحسب معمول گھر کی جانب روانہ ہوگئی۔زیبا ابھی بھی خاموش اور کھوئی کھوئی سی

تھی۔ چہرے پر ہمیشہ خوبصورت مسکان لئے رہنے والی بیوی کو اُداس دیکھ کر نوید نے اس کا سبب پوچھا، لیکن وہ ایسی کوئی بات نہیں کہہ کر ٹال گئی۔ نوید نے شاپنگ کے لئے معلوم کیا، تو اُس نے انکار کر دیا۔

نوید نے مزید کریدنا مناسب نہیں سمجھا اور کار ڈرائیو کرتا رہا۔ قریب آدھا گھنٹہ بعد گھر آ گیا۔ نوید نے کار پارٹیکو میں کھڑی کی۔ زیبا نے اپنی جانب کی کھڑکی کھولی اور اتر کر دھیرے دھیرے چلتے ہوئے گھر میں داخل ہو گئی۔ رمشاء اسکول سے آ چکی تھی اور دادی کے ساتھ ہنس کھیل رہی تھی۔ گاڑی پارک کر کے نوید بھی اندر آ گیا اور اپنے کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ ممی کو دیکھ کر رمشاء، دادی کو چھوڑ کر زیبا کے پاس آ گئی۔ اُس نے بیٹی کو گود میں لے کر پیار کیا۔ چار برس کی رمشاء انگلش میڈیم اسکول میں نرسری کلاس کی طالبہ ہے۔

نوید نے زیبا کی گود سے رمشاء کو اپنی باہوں میں لے لیا اور ہال میں آ گیا۔ ماں وہاں پہلے سے موجود تھیں۔ کچھ دیر بعد زیبا بھی چائے کی ٹرے لے کر ہال میں داخل ہو گئی۔ حالانکہ چائے کی چسکیوں کے بیچ زیبا ہنس بول رہی تھی، لیکن اس کے چہرے سے دلکشی غائب تھی۔ رات کے کھانے کے دَوران بھی زیبا کھوئی کھوئی نظر آئی، لیکن نوید خاموشی اختیار کئے رہا۔ سونے کے لئے بستر پر آنے کے بعد نوید سے نہ رہا گیا۔ اُس نے بڑے پیار سے زیبا کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔ ایک دوسرے کا دُکھ بانٹنے کے لئے میاں اور بیوی سے بہتر کوئی غمگسار نہیں ہو سکتا!!!

نوید کے دوسری بار سوال کرنے پر زیبا نے اپنی خاموشی توڑ دی، لیکن اداسی کا سبب بتانے سے قبل اس نے سوال کیا، ''نوید! آپ تو اس اسپتال میں ایک سال سے بھی زیادہ عرصہ سے ڈاکٹری کر رہے ہو۔ ہر طرح کے مریض آپ کے پاس آتے رہے ہوں گے۔ آپ نے یہاں کے لوگوں کو کس طرح کا پایا؟ کیسے لگے آپ کو یہاں کے لوگ؟''

''زیبا! یہاں دو طرح کے لوگ رہتے ہیں۔ بہت مالدار یا پھر بے حد غریب! کافی لوگ بہت اچھے، سیدھے، محنتی اور محبت کے بھوکے ہیں۔ انہیں کام

بتاؤ،تو دیر نہیں لگاتے ،حکم دو تو فوراً بجا لاتے ہیں۔ بہت معصوم ہیں لواو قبیلہ کے لوگ۔''نوید نے جواب دیا۔

''خواتین کے تئیں لواو کے مردوں کا رویّہ کیسا ہے؟''زیبا نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے معلوم کیا۔

''یہاں کے کئی قبیلوں میں مردوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔بزرگ پنچوں کا حکم چلتا ہے۔ وہ جو کہہ دیں،وہ حتمی ہوتا ہے۔عورتوں کو تو اُن کا فرمان ماننا ہی پڑتا ہے، کسی نوجوان مرد میں بھی ان کے خلاف لب کشائی کی ہمت نہیں ہوتی۔مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو؟ کیا بات ہے ؟کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟صاف صاف بتاؤ''نوید نے ایک کے بعد ایک کئی سوال کر ڈالے۔

''نہیں ،ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' زیبا نے ایک چھوٹے سے جملہ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے،تو پھر کیابات ہے؟ ضرور کچھ ایسا ہوا ہے،جسے تم چھپا رہی ہو!جس کی وجہ سے تم پریشان ہو۔تمہیں اس طرح گم صم، اُداس اور فکر مند پہلے کبھی نہیں دیکھا!! سچ بتاؤ کیا بات ہے؟''نوید نے اپنا سوال دوہرایا۔

زیبا نے ایک بار پھر چھت کی جانب دیکھا اور پلنگ کے تکیہ سے سہارا لیتے ہوئے کہنا شروع کیا،''نوید قریب قریب دنیا کے ہر حصہ میں مردوں کی اجارہ داری ہے۔تمام مرد خود کو اول اور عورتوں کو دوسرے درجہ کا شہری مانتے آئے ہیں۔حالانکہ ہمارے ملک سمیت کئی دیگر ممالک میں بھی عورتوں کے حقوق مردوں کے مساوی تسلیم کئے جا چکے ہیں،لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ ان پر پوری ایمانداری کے ساتھ عمل بہت کم ہو پاتا ہے۔ایک دَور تھا جب رسم و رواج اور مذہبی پابندیوں کے سبب ہمارے وطن میں شوہر کے انتقال کے ساتھ عورت کی زندگی بھی ختم ہو جاتی تھی۔ بیوہ کو شوہر کی چتا کے ساتھ زندہ جلنا پڑتا تھا۔ راجہ رام موہن رائے اور لارڈ ولیم بینٹک کی کوششوں سے ستی کی رسم بند ہو گئی اور بیواؤں کے لئے پھر سے شادی کرنے کا راستہ کھل گیا،لیکن

کینیا میں تو حد ہو گئی۔ 2015 میں حکومت کی طرف سے قانون بنا دینے کے باوجود لواو نام کا قبیلہ ابھی بھی پاکیزگی کے نام پر بیواؤں کے ساتھ جبر و تشدد اور حیوانیت کا برتاؤ کر رہا ہے۔ تکلیف دہ بات یہ بھی ہے کہ وہ ریپ جیسے گناہ کو مذہب کا لازمی جز مان رہے ہیں۔'' زیبا نے حیرت کا اظہار کیا۔

''تم کیا کہنا چاہتی ہو، میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ پہیلیاں بجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صاف طور پر بتاؤ، آخر ماجرا کیا ہے؟'' نوید نے اپنی بات دوہرائی۔

زیبا نے تفصیل سے بتانے کی کوشش کی۔ ''لواو قبیلے میں بیواؤں کی صفائی کے نام سے ایک قبیح رسم چلی آ رہی ہے۔ رسم کے مطابق عورتوں کو پاکیزہ کرنے کے لئے اُنہیں سیکس کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ان بدنصیبوں کو اجنبی مردوں کے ساتھ زنا کے اذیت ناک گناہ سے گزرنا پڑتا ہے!!!

''کیا.....؟؟؟''

جی ہاں! میری اُداسی کا سبب یہی ہے۔ آج جب میں او پی ڈی میں بیٹھی مریضوں کو دیکھ رہی تھی، تبھی امیلیا نام کی ایک پچاس سالہ خاتون اندر آئی۔ اُس نے کہا کہ وہ اُس سے کچھ دیر تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتی ہے۔ بہتر ہو جو سب سے آخر کا وقت اُسے دے دیا جائے۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ چیک اَپ کرتے وقت جب میں نے اُسے ماں بننے کی خوشخبری دی تو وہ رونے لگی۔ میری حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ میں رونے کی قیاس آرائی کر ہی رہی تھی کہ وہ بول اُٹھی، ''ڈاکٹرنی صاحبہ، میں بیوہ ہوں ۔کیا سماج کسی رانڈ کو بچہ پیدا کرنے کا حق دیتا ہے؟ میرے پیٹ میں پاپ پل رہا ہے اور میں ابھاگن زندہ ہوں۔ کاش یہ سب ہونے سے پہلے مجھے موت آ جاتی!''

''اس طرح کی درگتی کے لئے عورت ہی ذمہ دار ہوتی ہے۔ بیوہ کو تو زمانہ ویسے بھی چین سے نہیں رہنے دیتا۔ عورت کو یہ سب کرنے سے پہلے دس بار سوچنے کی ضرورت ہے۔ تم نے کیوں نہیں سوچا؟ اس سے اچھا تھا، کسی مرد سے باقاعدہ شادی کر لیتیں۔ اب نفسانی خواہش پوری کرنے کا خمیازہ تو تمہیں ہی بھگتنا ہے۔ بھگتو۔'' میں

نے اُسے نصیحت دے ڈالی۔

''یہی تو رونا ہے ڈاکٹرنی جی! آپ بھی مجھے ہی قصوروار سمجھ رہی ہیں۔ہم عورتوں کو مردوں کے سامنے زبان کھولنے کی اجازت کہاں ہے؟ اُن کا کام فرمان جاری کرنا اور ہمارا کام اُسے بے چوں چرا مان لینا بھر ہے۔ کچھ کہنے کی جرأت کی جائے، تو نافرمان سمجھا جاتا ہے۔آپ سمجھ رہی ہیں کہ میں نے اپنے جسم کے اندر دھدھکتی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اپنے آپ کو مرد کے حوالے کیا ہوگا!نہیں بی بی جی، نہیں!! لواو قبیلہ میں بیواؤں کی زندگی بڑی دشوار ہے۔قدیمی رسم کے تحت بیوہ کو صاف صفائی کے نام پر 'تطہیر' کے کرب سے گزرنا پڑتا ہے۔'' اتنا کہہ کر امیلیا نے گہرا سانس لیا۔

''قدیم رسم!تطہیر کا کرب!! یہ سب کیا ہے؟ ذرا تفصیل سے بتاؤ، تاکہ بات سمجھ میں آجائے۔'' ڈاکٹر زیبا کا تجسس بڑھ گیا۔

قبیلے کے مردوں کے نزدیک بیوہ گندی اور ناپاک ہو جاتی ہے۔شوہر کی روح کی بخشش اور خود کو پاکیزگی کا سرٹیفکٹ حاصل کرنے کے لئے بیوہ کو مرد کے ساتھ ہم بستر ہونا پڑتا ہے۔ بزرگ مرد، بیوہ کو اس کی مرضی کے خلاف کسی بھی مرد کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ مرد جان پہچان یا بستی کا ہو۔کئی بار اُنہیں اجنبی اور درندہ صفت وحشیوں کے ہاتھوں میں سونپ دیا جاتا ہے اور وہ اُنہیں بے دریغ نوچتے رہتے ہیں۔چار ماہ قبل خود اُس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ شوہر کے انتقال کے بعد وہ اپنے پوتے پوتیوں کے درمیان سکون سے تھی۔چونکہ بیوہ ہوگئی تھی، اس لئے اُسے بھی 'تطہیر' کی فرسودہ رسم سے گزرنا پڑا۔وہ اس رسم کے خلاف تھی، لیکن مردانہ فرمان کے سامنے اُس کی ایک نہ چلی۔

سنا کرتی تھی کہ 'تطہیر' کے لئے بیوہ کو پرائے مرد کے ساتھ ہم بستر ہونا پڑتا ہے۔ بے ہودہ رسم کی ادائیگی کے لئے سیکس کی شروعات فرش پر ہوتی ہے۔ بیوہ کو بے لباس ہو کر اپنے کپڑے فرش پر رکھنے پڑتے ہیں۔ اس کے بعد وہ بستر پر چلی جاتی

ہے، جہاں مرد اُس کے ساتھ جسمانی تعلقات بناتا ہے۔صبح اُٹھنے کے بعد فرش پر پڑے بدن کے اُترے کپڑے اور بستر کی چادر کو جلایا جاتا ہے۔ اس کے بعد مرد اُسترے سے اس کے سر کے بال مونڈتا ہے۔صاف صفائی کے نام پر زنا اور زنا بالجبر کا تماشہ تین دن تک چلتا ہے۔ مرد کی خاطر تواضع کے لئے بیوہ کو مرغی بھی پکانی پڑتی ہے۔چوتھے دن عورت کو اپنے والدین کے پاس جانے کی اجازت ہوتی ہے۔ نام نہاد پاکیزگی کے ایسے بُرے عمل سے گزرنے کے بعد خاتون کو پورا گھر دھوکر صاف کرنا پڑتا ہے۔تب کہیں جاکر اس کے بچے گھر میں واپس آپاتے ہیں۔عجیب وغریب دستور یہ بھی ہے کہ مرد کو اس بدفعلی کا معاوضہ بھی دیا جاتا ہے، جو زیادہ سے زیادہ 25,700 کینین شلنگ (ڈھائی سو ڈالر) تک ہوتا ہے۔حالانکہ حکومت اس پر پابندی لگا چکی ہے،لیکن کچھ غریب اور دیہی علاقوں میں یہ بدترین رسم ابھی بھی جاری ہے۔'' اتنا کہنے کے بعد امیلیا خاموش ہوگئی۔

''یہ دستور تو بہت بُرا ہے۔گناہ کے لئے آمادہ و مجبور کرنے سے تو بہتر ہے کہ بیوہ کی شادی کر دی جائے۔ اس کے خلاف واقعی احتجاج کئے جانے کی ضرورت ہے۔'' ڈاکٹر زیبا نے مشورہ دیا۔

''میں بیوہ ، ماں کے ساتھ دادی بھی ہوں۔اس نام نہاد پاکیزگی کے عمل سے گزرنے کے لئے مجھے جس مرد کے حوالے کیا گیا تھا ،وہ اجنبی ، قوی ۔ شرابی اور اوباش قسم کا تھا۔خون جاری ہونے کے باوجود وہ اپنی ہوس پوری کرتا رہا۔میں نے مرد سے کنڈوم استعمال کرنے کے لئے کہا تھا،لیکن وہ راضی نہیں ہوا۔نتیجتاً میں حاملہ ہو گئی۔اب بنا چاہا باپ تو پیٹ میں پل ہی رہا ہے،فکر یہ ہے کہ کہیں مجھے ایچ آئی وی کا ہلاک کر دینے والا مرض نہ ہو گیا ہو۔پامیلا،سوزن اور سپنا کے پیر بھی اُسی کی طرح بھاری ہیں ۔سوزین اور ڈائنا میں ایچ آئی وی کی تشخیص ہو چکی ہے۔'' امیلیا نے اپنے دکھ اور خدشات کا اظہار کیا۔

''یہ تو بہت تکلیف دہ اور افسوسناک ہے۔'' ڈاکٹر زیبا نے گہری سانس لی۔

"تطہیر کے نام پر منھ کالا کرنے والے مرد تو اپنے کام سے فارغ ہو کر چلے جاتے ہیں۔ان چاہا بوجھ تو عورت کو ہی جھیلنا پڑتا ہے !!میں بیوہ ہو چکی عورتوں کی طرف سے آپ کے پاس مدد اور تعاون کے لئے آئی ہوں۔ آپ ہماری رہنمائی کریں۔ قبیلے والوں کو بیدار کریں اور اس دقیانوسی رسم سے نجات دلائیں۔" اتنا کہہ کر امیلیا اُٹھی اور اگلے دن آنے کی بات کہہ کر چلی گئی۔

"واقعی یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ریپ ہے! کھلا ریپ!! دُنیا بھر میں خواتین کے حقوق بحال کئے جا رہے ہیں۔سعودی عرب جیسے کٹر اور مذہبی کہے جانے والے ملک میں مستورات تیزی سے خود مختاریت کی طرف بڑھ رہی ہیں ۔ جہاں تہاں عورتیں، مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کر رہی ہیں، لیکن لواو قبیلے کے لوگ ابھی بھی غیر مہذب اور جنگلی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ سب تعلیم کی کمی اور مذہبی رواج کے نام پر کیا جا رہا ہے۔ناسمجھ یہ بھی نہیں جانتے کہ بیوہ کے ساتھ کیا جانے والا یہ نازیبا عمل عورتوں کو پاک کرنے کی بجائے اُنہیں ناپاک اور پراگندہ کر رہا ہے۔" ڈاکٹر نوید نے اپنے تاثرات ظاہر کئے۔

ڈاکٹر نوید لواو کی بیوگان کے درد سے واقف ہو چکا تھا۔اُس نے زیبا کو یقین دلایا کہ اگر وہ ان مظلوم خواتین کی حقوق بحالی کے لئے کوئی کارگر قدم اُٹھانا چاہتی ہے، تو وہ قدم بہ قدم اُس کے ساتھ رہ کر ہر ممکن تعاون کرے گا۔زیبا کو شوہر سے یہی امید تھی۔ان الفاظ نے اُسے بڑی تقویت پہنچائی۔اُس کی آنکھوں میں امید کی چمک اور چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

اگلے روز ڈاکٹر زیبا نے امیلیا کا ایچ آئی وی ٹیسٹ کرایا۔امیلیا کا خدشہ صحیح ثابت ہوا۔ٹیسٹ میں مہلک مرض کی تصدیق ہوئی۔امیلیا اس حقیقت سے بخوبی واقف تھی کہ ایچ آئی وی کے مرض میں مبتلا شخص کی زندگی طویل نہیں ہوتی۔مختصر زندگی کے باوجود اُس نے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے اور 'تطہیر' کے جارحانہ قدیمی عمل کو روکنے کے لئے ہر ممکن احتجاج کا فیصلہ کر لیا۔ڈاکٹر زیبا اور اس کے شوہر کا ساتھ ملنے سے

اُسے یقین ہو گیا کہ دیر سویر لواو قبیلے کی بیواؤں کو 'تطہیر' کے نام پر جاری قبیح دستور سے نجات مل جائے گی۔

ڈاکٹر نوید نے اس بابت کئی لوگوں سے بات کی۔ انہیں اُونچ نیچ سمجھائی اور ہموار کرنے کی کوشش کی۔ کئی افراد کے خیالات میں تبدیلی دیکھ کر اُسے اپنا کام آسان ہوتا ہوا نظر آیا۔

اتوار کے روز ڈاکٹر زیبا و نوید نے قبیلے کے تمام لوگوں کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔ کھانے سے فراغت کے بعد اُنہیں دوسرے ملکوں میں زمانہ 'قدیم سے چلے آرہے کئی غلط رواجوں اور بے ہودہ رسموں کو ختم کئے جانے کی تفصیل سے جانکاری دی۔ ڈاکٹر نوید نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ شادی سے پہلے لڑکے کے ذریعہ لڑکی کے ساتھ جسمانی تعلق بنانا پوری طرح ناجائز اور گناہ ہے۔ اسے معاشرہ صرف اس لئے ناپسند کرتا ہے کہ ایسا کرنے سے لڑکی ناپاک ہو جاتی ہے۔ کسی بھی سماج کے لئے یہ اچھی نگاہ سے دیکھا جانے والا عمل نہیں ہے۔ لڑکے میں چاہے کتنے ہی عیوب ہوں، لیکن وہ شادی سے قبل بدفعلی کے عمل سے گزرنے والی لڑکی کے ساتھ شادی کرنے سے کتراتا دیکھا جاتا ہے۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ جب جسمانی تعلقات سے دوشیزہ ناپاک ہو جاتی ہے، تب کسی بیوہ کے ساتھ کیا جانے والا اسی طرح کا ناپسندیدہ اور گندہ عمل اُسے کس طرح پاکیزہ بنا سکتا ہے؟؟ ہمارے وطن میں بھی 'ستی' کی رسم تھی۔ مرد کی موت کے بعد بیوی کو شوہر کی چِتا کے ساتھ جلایا جاتا تھا، جبکہ عورت کے انتقال کے بعد مرد اس رسم سے مستثنیٰ رہتا تھا۔ اب یہ رواج بند ہو چکا ہے اور بیوہ ہو چکی خواتین کی دوبارہ شادیاں ہو رہی ہیں۔

ڈاکٹر نوید کے بعد ڈاکٹر زیبا نے کہنا شروع کیا، "لواو قبیلے کے ذمہ دار لوگوں! پاکیزگی کے عمل سے کئی عورتیں کسی حال سے ہو گئی ہیں۔ ان کے پیٹ میں پلنے والے بچے کسی بھی طور پر جائز نہیں کہے جا سکتے۔ کیا آپ نے کبھی سوچا کہ پیدا ہونے کے بعد ان بچوں کو کون اپنائے گا؟ اُن کی دیکھ بھال اور پرورش کی ذمہ داری

کس کی ہوگی؟ یہ بات سخت تکلیف دہ ہے کہ طبی جانچ میں دو عورتوں میں جان لیوا مرض 'ایچ آئی وی' کی تشخیص ہوئی ہے۔ان میں ایک حاملہ ہے۔اس کے بطن سے پیدا ہونے والا بچہ جنم سے ہی 'ایچ آئی وی پازیٹو' ہوگا۔ ماں اور بچے کو بربادی کے دہانے پر لا کھڑا کرنے والے سماج کے پاس اس خطرناک بیماری کا کیا کوئی علاج ہے؟ اس کے لئے کون جواب دہ ہے؟ایک دقیانوسی، فرسودہ،غلط،قبیح اور نقصان دہ رسم کو بے سبب زندہ رکھنے کے نتائج کبھی بھی اچھے نہیں ہو سکتے! سنجیدگی سے سوچئے۔اب تک ہونے والے نقصان کی تلافی تو ممکن نہیں، ہاں آئندہ کے لئے اس پر سختی سے کاربند ہو کر نئی نسلوں کے لئے بہتر راہِ عمل کو اُستوار کیا جا سکتا ہے۔فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔''

قبیلے والوں پر خاموشی طاری تھی۔سب ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔کوئی کچھ کہنے کی حالت میں نہیں تھا۔آخر کار قبیلہ کے سب سے بزرگ شخص پیٹرک کھڑے ہوئے،''ڈاکٹر صاحبان! آپ لوگوں نے ہمیں بیدار کر دیا ہے۔ ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔بات بھی سمجھ میں آگئی ہے۔موت اور حیات تو خدا کے قبضے میں ہے۔مرد کے انتقال میں عورت کا کیا قصور؟ بیوہ کو کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے؟ صرف اس لئے کہ قدیمی ریت ہے۔اگر ایک کے انتقال کے بعد دوسرے کو سزا دی جاتی ہے،تو عورت کی وفات پر مرد کے لئے کوئی سزا تجویز کیوں نہیں کی گئی؟ یہ واقعی ناانصافی ہے۔اب آگے ایسا نہیں ہوگا۔ میں مکھیا ہونے کے ناطے قبیلے کے مرد و خواتین کے درمیان اعلان کرتا ہوں کہ آج کے بعد بیوہ ہونے پر کسی عورت کو نام نہاد پاکیزگی کے قبیح عمل سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا۔آج سے بیوہ کو اپنی مرضی سے گھر بسانے کی بھی اجازت ہے۔وہ کسی بھی مرد کے ساتھ اپنی نئی زندگی کی شروعات کر سکتی ہے۔

اس فیصلے کے بعد ڈاکٹر نوید اور ڈاکٹر زیبا بہت خوش تھے۔امیلیا کے چہرے پر فاتحانہ چمک کے ساتھ اس کی آنکھیں چھلک آئیں!!

○○

(فروری ۲۰۱۸ء)
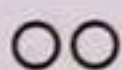
پیاسی محبت

اُس نے خود کو بستر پر پڑے پایا۔دروازہ کھلا تھا۔اُس کی سمجھ میں نہ آیا۔وہ چونک سا گیا۔سر میں پٹی بندھی تھی۔اُس نے سر پر ہاتھ پھیراا اور چلاّ اُٹھا۔آواز سن کر انجنا اُس کے کمرے میں آئی۔ایک لڑکی کو اپنی سمت آتے دیکھ کر اُس نے پوچھا،''میں کہاں ہوں؟ یہاں کیسے آیا؟ مجھے چوٹ کیسے لگی؟ بولتی کیوں نہیں؟ تم کون ہو اور یہ سب کچھ کیسے ہوا؟

بتاتی ہوں بھیا! بتاتی ہوں!! سب کچھ بتاتی ہوں!!! رات تم سڑک پر کنارے کنارے چلے جا رہے تھے۔اچانک ایک ٹیکسی گذری اور تم اُس کے پچھلے حصہ سے ٹکرا گئے۔سڑک پر دُور دُور تک کوئی نہیں تھا۔میری غیرت نے مجھے جھنجوڑ دیا۔دِل کے ایک گوشے میں محبت آئی۔محبت! بھائی کی محبت!! اور پھر میں کسی طرح تمہارے بے ہوش جسم کو سہارا دے کر اپنے گھر لے آئی۔سر میں کافی چوٹ لگی تھی۔ایک نرس ہونے کے ناطے میں نے اپنے فرض کو انجام دیتے ہوئے تمہاری مرہم پٹی کی۔

''بہن! کیا نام ہے تمہارا؟''

''انجنا!!''

انجنا نام سنتے ہی اُس کے ذہن میں ایک جھٹکا سا ہوا۔گذری ہوئی زندگی اس کی نظروں کے سامنے پردۂ فلم کی طرح تھرکنے لگی۔آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

بھیا! تم رونے لگے!! کیوں؟ کیا بات ہے؟ تمہیں کس بات کا دُکھ ہے؟ کہو!

میرے بھائی، مجھ سے کہو! کچھ تو کہو!!

کچھ نہیں! بہن کچھ نہیں!! تم سے مل کر مجھے اپنی بہن یاد آ گئی جو ایک عرصہ قبل مجھ سے بچھڑ گئی۔ اُس کا نام بھی انجنا تھا۔ بہت دن ہوئے، جب ہم دونوں چھوٹے تھے، ماں کا سایہ ہمارے سر سے اُٹھ گیا۔ پتا جی نے ہمیں باپ کے ساتھ ماں کا پیار بھی دیا۔ اُنہوں نے کبھی ماں جی کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ ہماری ہر ضد، ہر خوشی اور ہر خواہش کو پورا کرنے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ ہمیں کوئی غم نہ تھا۔ اچانک زندگی میں انقلاب آ گیا۔ ہمیں یہ اندازہ بھی نہ تھا کہ غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے۔ ایک روز سب سو رہے تھے۔ کچھ ڈاکو گھر میں گھس آئے۔ وہ لوٹ پاٹ کرنے کے ساتھ انجنا کو بھی اُٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ اُس کی گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی۔ چیخ اور کھٹ پٹ کی آہٹ سے میں بھی جاگ گیا۔ حالات سمجھتے دیر نہ لگی۔ میں اُن کے تعاقب میں لپکا ہی تھا کہ پتا جی کی دلسوز آواز گونجی، ''کمل!!'' میں جلدی سے لوٹ کر ان کے پاس آیا، لیکن ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ شاید مداخلت کے سبب ظالم ڈاکو پتا جی کے سینہ میں خنجر اُتار گئے تھے۔ میں چیخ مار کر گر گیا۔ میرے رونے چیخنے کی آواز سن کر محلہ والے اکٹھا ہو گئے۔ اس خوف زدہ، درد ناک اور افسوس کن منظر کو دیکھ کر ایثار و ہمدردی سے اُن کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

میرے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ مجھے راستہ دکھانے والا کوئی نہیں تھا۔ پہلے ماں کا ساتھ چھوٹ گیا، تو باپ کے سہارے جی رہے تھے۔ بہن کی جدائی سے دِل میں زخم ہوا اور باپ کی رحلت سے یہ زخم اور زیادہ گہرا ہو گیا۔ میں اِس وسیع دُنیا میں تنہا رہ گیا۔ جب گھر کا سب کچھ خرچ ہو گیا، تو پیٹ بھرنے کا بخار چڑھا۔ غم بھلانے کے لئے شراب کو زندگی کا مقصد بنا لیا۔ آخر تھک ہار کر جب کوئی چھوٹی موٹی نوکری بھی نہ مل سکی تو اِس ظالم سماج کے ٹھیکیداروں کی جیبیں ہلکی کرنے کا دھندا شروع کر دیا۔

زندگی کے سفر میں اچانک آئے موڑ کے سبب! آج!! آج مجھے پتا جی تو نہیں

مل سکے، مگر تمہارے رُوپ میں بہن ضرور مل گئی۔ مجھے یقین ہے کہ اَب میں اپنے آپ کو سنبھال اور سنوار لوں گا۔ کیونکہ جس کے لئے میری زندگی میں یہ گھناؤنا عمل آ گیا تھا، وہ اَب میرے سامنے ہے۔ میری بہن میری پاس ہے۔

انجنا کے پیہم اصرار پر کمل اُسی کے ساتھ رہنے لگا۔ اُس کی زندگی میں پھر سے بہار آ گئی۔ وہ بہت خوش تھا۔ اُس نے پھر سے نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ شومئی قسمت اُسے ایک فرم میں نوکری مل گئی۔ دونوں بھائی بہن روزانہ اپنی اپنی ڈیوٹی پر جانے لگے۔ دونوں کے درمیان پیار، محبت، خلوص اور اپنائیت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ جب تک ایک دوسرے کو دیکھ نہ لیتے تھے، بے چین رہتے تھے۔ ایک روز کمل شام کو گھر نہیں لوٹا۔ انجنا بے حد پریشان ہو گئی۔

کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی جب کمل نہ لوٹا، تب محبت کے ہاتھوں مجبور بہن بے چین و بے قرار ہو کر بھائی کی کمپنی میں پہنچ گئی۔ اُس نے کمپنی کے منیجر شیام سے اپنے بھائی کے بارے میں معلوم کیا۔ مگر وہ جواب دینے کی بجائے کچھ دیر اُسے دیکھتا رہ گیا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ”ہم نے کمل کو کمپنی کے ایک ضروری کام سے باہر بھیج دیا تھا۔ وہ آتا ہی ہوگا۔ آپ تشریف رکھیں۔“

بھائی کی خیریت پا کر انجنا کھل اُٹھی اور وہیں بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔ شیام وہاں سے اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ وہ بھائی کے خیال میں گُم تھی۔ کچھ دیر بعد ہونے والی کھٹ کی آواز سے اُس کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ یہ دروازہ بند ہونے کی آواز تھی۔ اُس نے دیکھا، ”شیام کی آنکھوں میں عیارانہ چمک اور لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ ہے۔“

”آپ نے دروازہ کیوں بند کیا؟ میرے بھیا کہاں ہیں؟ جواب دیجئے! بولئے!! دروازہ کھولئے اور مجھے جانے دیجئے!!!“ انجنا ایک ہی سانس میں کہتی چلی گئی۔

”کمل آج نہیں کل لوٹے گا۔“ شیام نے مختصر سا جواب دیا۔

''آپ نے جھوٹ کیوں بولا؟ مجھے روکے کیوں رکھا؟ مجھے بھائی کا انتظار کرنے کو کیوں کہا؟ کئی سوالوں کے ساتھ وہ چیخی چلائی، مگر وہاں اُس کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ ظالم منیجر نے ایک مجبور و بیکس دوشیزہ کا سب کچھ لوٹ لیا۔ ایک ہنستی اور مہکتی کلی کو بُری طرح مسل کر رکھ دیا۔ وہ رونے کے علاوہ کچھ نہ کر سکی۔ انجنا گھر پہنچ کر بہت روئی۔ روتی بھی کیوں نہیں۔ اُس کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ اس کے فہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ زیادتی کی گئی۔ ظلم کیا گیا۔ بھائی کی آمد کا فریب دے کر اُس کی عصمت کو تار تار کر دیا گیا۔

شرم و نفرت کے ملے جلے خیالات میں ایک دِن گزر گیا۔ شام کو کمل لوٹ آیا اور دفتر کے کام سے فراغت پا کر اسپتال پہنچا۔ انجنا کی ڈیوٹی اس کے ایک گھنٹہ بعد ختم ہوتی تھی۔ اِدھر اُدھر دھیان کرنے کے باوجود انجنا اُسے اسپتال میں کہیں نظر نہیں آئی۔ ایک نرس سے معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ وہ آج اسپتال نہیں آئی۔

کمل پریشان ہو گیا۔ وہ مضطرب حالت میں گھر پہنچا۔ گھر میں بہن کی آواز نہ سن کر اُس کا دِل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ چلاّ اُٹھا، ''انجنا! انجنا!!''

انجنا کمرہ کھول کر باہر آئی اور بھائی سے چمٹ کر رونے لگی۔ وہ برابر روئے جا رہی تھی۔ کمل یہ سب کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اُس سے رہا نہ گیا۔ آخر کار اُس نے پوچھ ہی لیا۔

''تم کیوں رو رہی ہو؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟ میری بہن! مجھے بتاؤ تو سہی، بات کیا ہے؟ میں بھی تو جانوں، میری بہن کے رونے کی وجہ کیا ہے؟ آخر ہوا کیا ہے؟ بتاؤ۔ مجھے سب کچھ اور صاف صاف الفاظ میں بتاؤ۔''

اس کے بعد ایک مظلوم بہن نے روتے ہوئے اپنی بربادی کی داستان بھائی سے کہہ سنائی۔

بہن کی بربادی کی کہانی سن کر کمل تمتما اُٹھا۔ غصہ کے سبب اُس کا رواں رواں سخت ہو گیا۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ ہاتھ پاؤں کپکپانے لگے۔ اُس نے انجنا کے سر پر

ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ وہ اُس ذلیل سے اپنی بہن کی بے عزتی اور بربادی کا بدلہ ضرور لے گا۔

سیاہ رات اپنا آدھا سفر طے کر چکی تھی۔ ماحول میں سناٹا تیر رہا تھا۔ پائیں باغ میں دُور دُور تک روشنی نہیں تھی۔ اس ہیبت ناک رات میں ایک سایہ تیزی سے شیام کی کوٹھی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ میں کھلا ایک لمبا چاقو مضبوطی کے ساتھ تھام رکھا تھا۔ اُوپری کھڑکی سے روشنی چھن کر باہر نہیں آرہی تھی۔ وہ پائپ کا سہارا لے کر اُوپر پہنچا۔ اندر دیوار کے سہارے سہارے وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک اُس کا ہاتھ الماری سے ٹکرایا اور ایک چھناکے کی آواز کمرے میں گونج گئی۔ الماری کے اُوپر رکھی کوئی چیز فرش پر گر گئی تھی۔ اسی کے ساتھ کمرہ بھی روشنی سے بھر گیا۔

سامنے انجنا کھڑی تھی! اُس کی حقیقی بہن!! اُسے یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ مجسمہ بنا کھڑا رہا۔ انجنا نے اپنے سامنے کمل کو کھڑے دیکھا۔ وہ بھیا بھیا کہہ کر اس سے لپٹ گئی۔ رونے دھونے کی آواز سن کر شیام کی آنکھ کُھل گئی۔ اُس نے دیکھا سامنے کمل اپنے ہاتھ میں لمبا چاقو تھامے کھڑا ہے۔ انجنا اُسے بھیا بھیا کہہ رہی ہے۔ حالات کا جائزہ لیتے شیام کو دیر نہ لگی۔ اُس نے شرمندگی اور پشیمانی کے عالم میں پھر سے اپنا بد رنگ چہرہ ڈھک لیا اور گہرے خیالوں میں ڈوب گیا۔ شیام کو اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ مارے شرم کے وہ بستر میں گڑا جا رہا تھا۔ اُسے اپنے اُوپر شیطان سوار ہوجانے کا ملال تھا، لیکن اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ یقیناً اس کا گناہ ناقابل معافی ہے۔ اس نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو ہر سزا کے لئے تیار کر لیا تھا۔

کمل کی نگاہ دیوار پر لگی شیام کی تصویر پر گڑی تھی۔ تبھی انجنا کی آواز اُبھری، ''بھیا یہ شیام بابو ہیں۔ ان ہی کی بدولت تمہاری بہن ایک ویشیاء کی زندگی گزارنے سے بچ گئی، ورنہ ڈاکوؤں نے اُسے طوائف بنانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ شیام بابو نے ایک موٹی رقم کے عوض مجھے اس غلیظ کوٹھوں کی بستی سے خرید لیا، جہاں مجھے چھ ماہ تک اپنی زندگی تبدیل کر طوائف بننے کے لئے مجبور کیا گیا تھا۔ شیام بابو مجھے لے کر

گھر پہنچے ،مگر وہاں تم موجود نہیں تھے۔ پتا جی کی موت کی بابت جانکاری ہوئی ۔ تمام حقیقت جان کر بہت دُکھ ہوا۔ میں یہ سب برداشت نہ کر سکی۔ اس طول وعرض کی دنیا میں سوائے شیام بابو کے مجھے کسی نے سہارا نہیں دیا۔ میں اکیلی کب تک بھٹکتی؟ آخرکار میں نے ان سے شادی کر لی ۔ اپنی مرضی سے! شیام بابو بہت بھلے آدمی ہیں۔ اگر یہ میری زندگی میں نہ آتے، تو آج میں عزت کی زندگی بسر کرنے کی بجائے کسی ذلیل کوٹھے کی زینت بن کر رہ جاتی!

شیام سے نہیں رہا گیا۔ وہ بھائی بہن کے بیچ ہو رہی گفتگو کے دوران اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ ''کمل میں تمہارا گنہگار ہوں اور ہر سزا کے لئے تیار ہوں۔ تم.....''

ابھی شیام کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ چاقو پر نظر پڑتے ہی انجنا چونک گئی۔ اس نے پوچھا، ''بھیا! تم خاموش کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟ تمہارے ہاتھ میں چاقو.... بھیا! یہ چاقو!! بولو بھیا! بولو!! تمہارے ہاتھ .....میں یہ......چاقو......کیوں ہے؟''

''انجنا! میری پیاری بہن!! کیسے کہوں؟ کیوں ہے؟؟''

○○
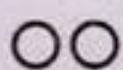
(مارچ ۱۹۷۴ء)

پاگل سپنے

سورج بُری طرح بھبک رہا تھا۔گرمی کے مارے بُرا حال تھا۔غریب داس ایک ٹک ریل کی ان پٹریوں کو نگاہِ حسرت سے تک رہا تھا، جواس کے معاش کا خاص ذریعہ تھیں۔سویرے کے سات بجے پہلی ریل گاڑی آکر ٹھہرا کرتی تھی۔وہ روزانہ سویرے ہی اسٹیشن پہنچ جاتا، جہاں اس سے پہلے اُس کے پانچ دیگر ساتھی کھڑے ہوکر اس کی آمد کے منتظر ہوتے ۔ بعد قرعہ اندازی اپنے اپنے حصوں پر گاڑیاں بانٹ لی جاتیں۔یہ کچھ نصیب کا ہی پھیر تھا یا مقدر کا کھوٹ، غریب داس کے حصہ میں شام کی تیسری گاڑی آتی یا پھر دوسری ۔ پہلی اور آخری گاڑی تو گویا اس کی تقدیر میں تھی ہی نہیں۔

شہر میں بے کاری گشت کر رہی تھی۔جان توڑ محنت کے بعد بھی پورے دن میں مشکل سے ڈیڑھ دو روپے مل پاتے تھے ۔ اسٹیشن کے انچارج سے کہہ سن کر اُنہوں نے گاڑیاں اس طرح بانٹ لی تھیں، گویا ایک طرح سے ٹھیکا لے لیا ہو۔ اِسی میں ان کو کچھ اوسط آجاتا تھا۔

وہ روزانہ نئے خروش اور نئے جذبہ کے ساتھ سویرے اُٹھ جاتا۔جلدی سے میلی پُرانی دری کو جھاڑتا اور اس کے ہر پیوند پر پیار سے ہاتھ پھیرتا۔پھر اسے لپیٹ کر گھر کے کونے میں پڑی کاٹھ کی پٹری پر رکھ دیتا۔ باہر صحن میں رکھے گھڑے سے پانی نکال کر منہ پر دو تین جھپکے مارتا اور بوسیدہ صافہ سے منہ صاف کرتا۔ایک نظر بھر کر اپنے ننگے پیروں کی طرف بھی دیکھتا، جو اسے ایک عجیب انداز میں چڑاتے نظر آتے گویا کہہ

رہے ہوں تو ہمیں کیا صاف کرتا ہے گریبو؟ ہمیں تو کچھ دیر کے بعد پھر ایسا ہی یا اور بھی گندہ ہو جانا ہے ۔ اس کے بعد وہ جلدی سے چادر اُٹھا کر اپنے پیروں پر مارتا۔ اَوڑھنے والی چادر کو نیکر کے اُوپر باندھ کر گھر سے نکل جاتا۔ راستہ میں اس کی نظر سامنے کی جانب اُوپر نیچے اُٹھ جاتی تھی۔ بازار کی رونق اور اِدھر اُدھر کی چیزوں میں اُسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اِسی صورت میں وہ ریلوے اسٹیشن پہنچ جاتا۔

رات کی دونوں گاڑیاں جن کے حصے میں پڑ جاتیں، وہ خوش نصیب سمجھے جاتے۔ چونکہ رات کی دونوں گاڑیوں کا کوئلہ رات بھر یوں ہی پڑا رہتا۔ صبح سویرے وہ دونوں فریق اُسے اُٹھا کر لے جاتے جن کے مقدر میں رات کی گاڑیاں ہوتیں۔ رات دِن میں اسٹیشن پر کُل چھ گاڑیاں آتی تھیں۔ غریب داس کو اپنی گاڑی کا برابر انتظار رہتا۔ گاڑی لیٹ بھی ہو جاتی، تو اِسے پرواہ نہ ہوتی۔ گاڑی آتے ہی مارے خوشی کے اُس کا دِل پھولا نہ سماتا۔ بھوک مٹ جاتی، پیاس بجھ جاتی اور وہ انجن کے نیچے گرتے ہوئے سُرخ سُرخ کوئلوں میں اِس طرح کھو جاتا، جیسے وہ کوئلے کوئلے نہ ہوں، بلکہ سونے کے ٹکڑے ہوں۔ گاڑی کے چلے جانے کے بعد وہ فوراً راکھ کے ڈھیر کے پاس پہنچ جاتا، جس سے ابھی بھی برابر آنچ اُٹھ رہی ہوتی ۔ وہ دَوڑ کر کچھ فاصلہ پر کھڑی سدا سہاگن کی گیلی لکڑی توڑ کر لاتا اور اُس سے راکھ کے ڈھیر کو کرید کرید کر ٹھنڈا کرتا اور پھر کوئلے بٹورتا۔ کوئلے اکٹھے ہو جانے کے بعد وہ انہیں بوری میں بھر کر شہر کے دوسرے نکڑ پر دَیا حلوائی کی دُکان پر لے جاتا۔ دیا حلوائی اُسے کوئلوں کے پیسے دے دیتا۔ ہاتھ میں پیسے لیتے وقت تمام دن کی کلفت خوشی میں تبدیل ہو جاتی۔ ابھی وہ پیسے رکھ ہی رہا ہوتا، تبھی ٹھیلے والا پکار کر کہتا، ''بھیا گریبو اپنی مجدوری تو دے دو!!''

''ارے ہاں بھیا! میں تو بھول ہی گیا تھا، یہ لو۔'' ہنستے ہوئے غریب داس بول دیتا۔

''تمہاری گلتی نائے ہے بابو، پیسوں میں گرمی ہی ایسی ہووے ہے۔'' ٹھیلے والا بھی دانت نکال دیتا۔

''غریبو! ارے او غریبو!! یہ اپنی بوری تو لیتا جا۔ کل کوئلہ نہیں لائے گا کیا؟'' دیا حلوائی کی آواز سے اس کا دھیان بکھر جاتا اور وہ دُکان سے اپنی خالی بوری اُٹھا کر چل دیتا۔ اگلے موڑ پر لگے نل پر وہ ہاتھ منہ دھوتا اور کچھ ٹھنڈا پانی حلق سے نیچے اُتار لیتا۔ اس سے اس کی کچھ تھکن دُور ہو جاتی اور وہ تیز قدموں سے لالہ ڈال چند کی دُکان پر چڑھ جاتا۔ ''لالہ جی رام رام!''

''ر..ا....م، ر...ا...م بھئی، رام رام!!'' لالہ جی کی چپچپی زبان کُھل جاتی۔

''لالہ جی یہ تین روپے جمع کر لیجئے۔''

''جمع تو کر لوں گا، مگر اس طرح کب تک ہوتا رہے گا؟ ایسے کیا کام چلے گا؟ اس سے زیادہ تو بیاج ہو جاتا ہے۔ اور پھر میرے پاس تمہارے فالتو کام کے لئے وقت اور قلم کاغذ کہاں ہے؟'' اور اِسی کے ساتھ ایک جھٹکے سے تین روپے لالہ جی کی صندوقچی میں گر جاتے اور غریب داس خاموش قدموں سے دُکان سے باہر نکل جاتا۔ اس کے پاؤں من من بھر کے ہو جاتے۔ اب اس کے چہرے پر خوشی نہیں تھی، چال میں تیزی نہیں تھی، دِل میں اُمنگ نہیں تھی اور آنکھوں میں چمک بھی نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ ہولے ہولے قدموں سے آگے بڑھے جا رہا تھا۔ ماضی کی سمت! اُس دن کی طرف جس دن سے اُس کی زندگی منسلک ہو چکی تھی۔ وہ وقت اب بھی اس کے ذہن میں ویسے ہی روشن تھا، جیساہ دو سال قبل۔ وہ دِن اُسے آج بھی بخوبی یاد تھا، جب وہ رُوپا کے ساتھ اپنے دالان میں قدم رکھ رہا تھا۔ اُس کی ماں نے بیٹے کے ساتھ رُوپا کو دیکھ کر نظریں جھکا لیں تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ رُوپا اور غریب داس کا میل جول ٹھیک نہیں ہے۔ کہاں لکھپتی باپ کی بیٹی اور کہاں ایک مفلس و بیکس کا معمولی بیٹا!!

رُوپا کو اپنے گھر میں دیکھ کر غریبو کی ماں نے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی۔ اُس نے رُوپا کو ہنسی خوشی بٹھایا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور پھر پیار سے وداع کر دیا۔ رُوپا کے گھر سے باہر جانے کے بعد ماں کی آنکھوں میں غصہ بھر گیا، ماتھے پر بل پڑ

گئے۔وہ کہے جا رہی تھی۔ ''غریب داس تمہارا یہ قدم مجھے پسند نہیں۔ ٹاٹ اور مخمل کا ساتھ نہیں ہوتا۔کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی؟''

''ماں تم غلط سمجھ رہی ہو۔رُوپا بہت ہی ملنسار اور غریب پرور ہے۔وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ماں صرف مجھ سے۔ دھن دولت اور روپے پیسے سے نہیں۔اُس کا کہنا ہے ماں، ''غریب اور امیر تو قدرت کے بنائے ہوئے ہیں۔غریبو!میں ہر حال میں اور دل کی گہرائی سے تم سے محبت کرتی ہوں۔میں تم سے بچھڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔'' ماں جب تک وہ اسکول میں مجھے دیکھ نہیں لیتی،اُسے سکون نہیں ملتا۔ جب تک دو چار باتیں نہ کر لے،اُسے چین نہیں آتا۔اور پھر میں بھی تو اس سے بے انتہا پیار کرنے لگا ہوں۔

میرے بھولے بیٹے،تم اُس کی محبت کے دام میں مقید ہو۔جوانی دیوانی ہوتی ہے۔میں نے دُنیا دیکھی ہے۔ مجھے اس جہان کے ہر ہر فریب سے واسطہ پڑ چکا ہے۔ بیٹا جس طرف تم بڑھ رہے ہو،وہ تمہاری منزل نہیں ہے۔یہ آب نہیں،سُراب ہے۔ روشنی نہیں، اندھیرا ہے۔میں مانتی ہوں تمہیں پیار ہے،محبت ہے،لیکن میرے پیارے بیٹے !یہ ظالم سماج اور سرمایہ داروں کی دُنیا اتنی جابر ہے کہ ہم جیسے عام لوگ اس کے مضبوط اور سخت جان پنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔میں تمہاری ماں ہوں اور کوئی بھی ماں اپنے بیٹے کو بربادی کے غار میں جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔تم اس راہ کو مت اپناؤ۔اس کا باپ تمہارے اس خواب کو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دے گا۔عزت اور دولت کا مالک بھلا تم جیسے نادار کو اپنی بیٹی کس طرح دے سکتا ہے۔امیری اور غریبی کی اس خلیج کو آج تک کسی نے نہیں پھاندا ہے، بیٹے!کسی نے نہیں!!

''میں پھاندوں گی ماں!اس خلیج کو!! سدا کے لئے میں ختم کر دوں گی اس فاصلے کو!!۔'' روپا نے گھر میں قدم رکھتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔

''روپا!تم واپس آ گئیں۔گھر نہیں گئیں!! آؤ آؤ!!! بیٹھو۔'' غریب داس کی ماں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''میں نے آپ کی ساری باتیں سن لی ہیں ماں! میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ مجھے غریبو سے بے حد پیار ہے۔ غریبو کے علاوہ کسی اور کا تصور بھی میرے وہم و گمان میں نہیں ہے۔'' رُوپا نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

رُوپا چلی گئی اور اپنے گھر جا کر اُس نے اپنی محبت کا اعلان بھی کر دیا۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ لالہ ڈال چند شہر کا بڑا آدمی اپنی اکلوتی بیٹی کا ہاتھ دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنے والے کنگال غریبو کے ہاتھ میں تھما دیتا۔

''پتا جی! میں غریب داس سے محبت کرتی ہوں۔ اُس سے پیار کرتی ہوں۔ اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکوں گی......''

''رُوپا! تو اپنے باپ کی عزت کو داغدار بنائے گی۔ میری شہرت کو مٹی میں ملائے گی۔ تو نے اپنی زبان کھولنے سے قبل یہ کیوں نہیں سوچا کہ ہم دولت مند اور اہل ثروت ہیں۔ شہر کے بڑے مالداروں میں ہماری گنتی ہوتی ہے، بلکہ یوں کہا جائے کہ شہر میں ہمارا کوئی ثانی نہیں ہے۔ وہ ایک غریب، مفلس، نادار اور لاچار ہے۔ مفلس و لاچار بھی ایسا کہ جس کا مکان تک ہمارے پاس گروی رکھا ہے۔ یہ رشتہ نہیں ہو سکتا! کبھی نہیں ہو سکتا!!

لالہ ڈال چند نے غصہ میں یہ سب کہہ تو دیا، لیکن آخر بیٹی ہوتی ہے۔ بیٹی کی ضد اور اس کے موہ کے سامنے وہ خاموش تو ہو گئے، لیکن ہار نہیں مانی۔ ذہن پریشان تھا، دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ اس کے باوجود اُنہیں ایک ترکیب سوجھی۔ رُوپا اور غریب داس کو بلا کر اُنہوں نے کہا، ''بیٹا غریب داس! ہمیں تمہاری محبت پر اعتراض یا گریز نہیں ہے۔ ہمیں تم دونوں کے پیار کا یقین ہے۔ ہمیں تمہاری شادی کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہے، لیکن یہ تو بتاؤ کہ شادی کے بعد تم اپنی بیوی کو رکھو گے کہاں؟ تمہارا مکان تک تو ہمارے پاس گروی رکھا ہے۔ ہماری ایک چھوٹی سی شرط ہے۔ شادی سے قبل تمہیں اپنی کمائی سے گروی رکھے اپنے مکان کو چھڑانا ہوگا۔ جب تک تم اپنا مکان نہیں چھڑا لیتے ہو، تب تک یہ شادی نہیں ہوگی۔ اس دوران تم رُوپا سے بھی

نہیں ملو گے!!!'' اتنا کہہ کر لالہ جی خاموش ہو گئے۔

غریبو اور روپا کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ دو دھڑکتے معصوم دلوں کو الگ کیے جانے کا اعلان کر دیا گیا۔ روپا جانتی تھی کہ اس کے باپ ضدی قسم کے شخص ہیں۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوں گے، لیکن یہ خوشی بھی کسی حد تک کم نہیں تھی کہ انہوں نے ''ہاں'' کہہ دی۔ اس کے باوجود شرط تو شرط ہوتی ہے۔ رُوپا کو حاصل کرنے کے لئے غریبو نے سب کچھ منظور کر لیا۔ دِن رات محنت و مشقت کر کے روپے اکٹھا کرنے کی ٹھان لی۔ نوکری کی تلاش جاری رکھی مگر نصیب کچھ اور ہی کھیل کھیلنے والا تھا۔ غریبو کی ماں بیمار پڑ گئی۔ بیمار بھی ایسی پڑی کہ پھر اُٹھ نہ سکی۔ دو مہینے کی سخت منزل کو اُس نے تو پار کر لیا، لیکن غریبو کو آدھی منزل پر روتا بلکتا چھوڑ گئی۔

غریبو جب لالہ جی کو روپے دیتا تو اس آس پر دیتا کہ اس کا کچھ وزن ہلکا ہو جائے گا، مگر یہ صرف اس کا وہم اور گمان ہی تھا۔ اور...... لالہ جی جب تلخ لہجہ میں یہ کہہ دیتے کہ ایسا کب تک ہوتا رہے گا، تو اُس کی جان ہی نکل جاتی۔ وہ سوچنے لگتا کہ یہ سب کیا ہے؟ کیا اس طرح وہ رُوپا کو پا سکتا ہے؟ نہیں..... نہیں، ایسے رُوپا نہیں مل سکتی۔ اگر رُوپا کو حاصل کرنا ہے، تب کچھ اور کرنا ہوگا۔ کچھ اور....، لیکن کیا؟ چوری! ڈاکہ!! قتل و خون!!! لُٹیرا بن جائے اور ایک خونخوار ڈاکو کی شکل اختیار کر لے!! راہزن کی زندگی گزارے۔ اپنی محبت، محبوبہ اور رُوپا کے لئے!!! اور...... پھر اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہ رہے۔ دھن دولت سبھی کچھ ہو۔ ہر طرح کا عیش و آرام مہیا ہو۔ مگر یہ سب ہونے کے بعد گھر تو پھر بھی ویران ہی رہے گا۔ ایک ڈاکو کے گھر میں رُوپا کیسے آئے گی؟ ایک لُٹیرے کے لئے رُوپا کی محبت ختم ہو جائے گی۔ ''میری رُوپا تجھ تک کیسے رسائی ممکن ہو؟ ظالم سماج کی اُونچی دیوار کو کس طرح عبور کروں؟ عہد و پیمان کو کیسے توڑوں؟ آج تیری شادی ہو جائے گی۔ میں دیکھتا رہ جاؤں گا۔ میں تیرے باپ سے کیا گیا وعدہ پورا نہیں کر سکا۔ میں ہار گیا۔ تیرے باپ سے، سرمایہ دار سے، سماج کے ٹھیکیدار سے، ایک فریبی اور غدّار سے.....''

وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ رُوپا کی آواز نے اُسے چونکا دیا، ''غریبو!'' رُوپا دُلھن کے سرخ لباس میں لپٹی ہوئی اُس کے سامنے کھڑی تھی !!اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔وہ اپنی قسمت پر رو رہی تھی۔

رُوپا کو اپنے سامنے دیکھ کر غریبو حیران رہ گیا۔اس کی زبان سے نکلا'' رُوپا تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔آج تمہاری شادی ہو رہی ہے۔جاؤ واپس چلی جاؤ۔ گھر پر سب لوگ تمہارے منتظر ہوں گے۔لالہ جی کی عزت کا سوال ہے۔ جاؤ...رُوپا!! واپس چلی جاؤ!!!

''نہیں....! غریبو!! نہیں..!!!میں واپس جانے کے لئے نہیں آئی ہوں۔میں تمہارے علاوہ کسی دوسرے مرد کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔چلو کہیں بھاگ چلیں۔میرے پاس دھن، زیور سبھی کچھ ہے چلو جلدی کرو۔کہیں پاس کے مندر میں جا کر شادی کر لیں۔غریبو جلدی کرو۔میرے حال پر رحم کھاؤ۔وقت بہت کم ہے، ورنہ وہ لوگ مجھے تلاش کرتے ہوئے یہاں آ جائیں گے اور میں کسی اور کے گلے سے زبردستی لپیٹ دی جاؤں گی۔......'' رُوپا اپنی بات کہے جا رہی تھی۔

غریبو خاموش کھڑا تھا۔اُسے رُوپا کے نظریہ سے اتفاق نہیں تھا۔وہ ہار مان چکا تھا۔

اُس نے لالہ جی کی عزت کو بٹہ لگانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ اُسے اپنے ساتھ لے گیا۔کسی مندر میں نہیں، بلکہ اُس منڈپ میں جہاں اہل خانہ اور سینکڑوں لوگ رُوپا کے لئے پریشان و مضطرب تھے۔

سماج کے ظالم ٹھیکیداروں نے غریبو کی قربانی کی قدر نہیں کی۔دونوں کو اس طرح ساتھ دیکھ کر طرح طرح کے الزام تراشی کی ۔غریبو اپنی بے عزتی تو برداشت کر سکتا تھا، لیکن رُوپا کی بدنامی اُس سے برداشت نہیں ہوئی۔اُس سے رہا نہ گیا۔وہ اپنی محبت کو بدنام ہوتے دیکھ نہ سکا۔صفائی میں اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ پڑا۔اُس نے زبان سے بنا کوئی لفظ ادا کئے سرمایہ داروں اور وقت کے ٹھیکیداروں کے منہ پر ایک ایسا طمانچہ رسید کر دیا، جس کی امید نہیں کی گئی تھی۔اُس نے زمانہ کو جتا دیا

کہ پاک محبت اُس آئینہ کی طرح شفاف ہوتی ہے، جس میں کوئی بال نہیں ہوتا۔ پاک محبت پر ناپاکی کا بدنما داغ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کے لئے اُسے چاہے جتنے بھی رُوپ کیوں نہ اختیار کرنے پڑیں! کتنی بھی قربانی کیوں نہ دینی پڑیں!!

رُوپا رخصت ہوگئی۔ غریب داس بہت خوش تھا۔ اب اس میں اتنی طاقت تھی کہ وہ فخر سے اپنے سر کو اُونچا اُٹھا سکتا تھا۔ آسمان کی جانب دیکھ سکتا تھا۔ وہ پھولا نہیں سما رہا تھا۔ منزل پر پہنچنے کے بعد اُس نے جو قربانی دی تھی، اُس کی مثال ملنا ناممکن نہیں، تو مشکل ضرور تھی۔

شام کا وقت تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں گم صم کھڑا تھا۔ تبھی کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ یہ ہاتھ لالہ جی کا تھا، جو کہہ رہے تھے، ''بیٹا غریبو!! رُوپا کے سر پر رکھے تیرے شفقت بھرے ہاتھ کی گرمی اور پاک محبت کی صفائی میں رُوپا کی ساڑی سے نکال کر اپنے ہاتھ میں باندھے پیار کے چند دھاگوں نے میری لاج رکھ لی۔ میں دھنیہ ہوگیا!! غریبو! تم میرے بیٹے ہو!!! آج میں نے اپنی ساری دولت اور جائیداد تمہارے نام کر دی ہے۔ اَب تم غریب داس نہیں رہے۔ آج سے تم سیٹھ لکھپت سنگھ ہو! لکھپت سنگھ!!

غریبو نے لالہ جی کی جانب دیکھا! اُسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ قدرت نے اُسے بھی مالدار بنا دیا ہے!! وہ غریب داس کی جگہ لکھپت سنگھ ہو گیا ہے!!! لیکن...... اَب کیا کرے گا اس جائیداد کا؟ کس کام کی یہ دولت؟ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ مسکراہٹ ہنسی میں تبدیل ہوگئی! اچانک وہ ہنسنے لگا! تلخ ہنسی، لگاتار، بے تحاشہ، پاگلوں کی طرح!!!

OO
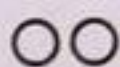
(جولائی ۱۹۷۷ء)

آگ کا دریا

''آج آپ کو ڈسچارج کیا جا رہا ہے۔خدا کے فضل سے اب آپ روبہ صحت ہیں۔ چلنے پھرنے کے علاوہ ضرورت پڑنے پر دَوڑ بھی سکتے ہیں۔اب آپ گھر جا سکتے ہیں، لیکن گھر جانے کے بعد ہمیں نہ بھول جائیے گا۔''وہ ایک سانس میں پتہ نہیں کیا کیا کہہ گئی تھی۔

لیکن ثاقب! وہ پوری طرح ڈوب چکا تھا،اُس کی گہری نیلگوں آنکھوں میں۔کچھ تلاش کرتا کرتا،دُور کافی دُور!!ایک دن وہ موٹر سائیکل پر سوار اپنے خیالات میں سرگرم دَوڑ رہا تھا کہ سامنے سے آرہی فور وہیلر وین سے اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ٹکر لگتے ہی وہ سڑک کے کنارے جا پڑا۔موٹر سائیکل کا بھاری حصّہ اُس کے پاؤں کو مجروح کر چکا تھا۔بند چوٹ کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں چوٹیں کھل بھی گئی تھیں۔

اسپتال پہنچنے کے دو گھنٹے بعد ایک نرس اُس کے سامنے سے ہوکر گزری۔تھوڑا ٹھٹکی اور پھر واپس آئی۔ایک نظر دیکھا اور پھر بغیر کچھ کہے سُنے واپس چلی گئی۔

نرس کے جاتے ہی اُس کے دماغ میں انگنت سوالات نے سر اُبھارا۔ایک، دو، تین، چار......تقریباً نصف درجن سے زائد نرسوں میں سے جو اُس سے قبل اس کے پاس سے گزر چکی تھیں، یہ کچھ الگ طبیعت کی نظر آئی۔صرف وہی ایک ایسی نرس تھی، جس نے ایک دو قدم پیچھے لوٹ کر اُس کی جانب مخصوص نظروں سے دیکھا اور پھر خاموشی کے ساتھ آگے کی سمت چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہی نرس پھر اُس کے قریب آئی۔ وہ اُسے دیکھ ہی رہا تھا کہ اس کے پردۂ سماعت پر صنفِ نازک کی نقرئی آواز کی حلاوت محسوس ہونے لگی۔ "آپ کو ایکسرے رُوم چلنا ہوگا۔" تبھی ایک دوسری نرس بھی آگئی اور دونوں اُس کے بیڈ کو دھکیلتے ہوئے ایکسرے والے کمرے میں لے گئیں۔

ایکسرے ہوا۔ ڈاکٹروں نے اُسے دیکھا، ہڈی فریکچر ہوگئی تھی۔ جوڑ ملاتے ہوئے ٹوٹی ہڈی کو بٹھایا گیا۔ جوڑ ملنے کے بعد دوبارہ ایکسرے کیا گیا۔ اطمینان ہونے کے بعد پلاسٹر کیا گیا۔ الغرض علاج و معالجہ چلتا رہا۔ اور پھر ایک دن ایسا آیا کہ ثاقب کو نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں کے حسین ماحول سے جدا ہونا پڑا۔

اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے ٹھیک پانچ روز بعد وہ ناہید سے ملنے آیا۔ اس کے بعد وہ دوسرے اور تیسرے دن کے وقفہ سے برابر آتا جاتا رہا۔ ملاقات کے سلسلہ کے سبب وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔ پھر پیار و عقیدت کے غنچوں نے وہ سماں باندھا کہ باغِ محبت اپنی مخصوص خوشبو سے معطر ہوگیا۔ دونوں بے سدھ ہوگئے۔ ہر ایک کے لبوں پر مسکراہٹ اور تازگی تھی۔ چہرے مثلِ گلاب خندہ و درخشندہ تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ دونوں ماضی کی تلخیوں کو ایک سانس میں گلے سے نیچے اس طرح اُتار چکے تھے، جیسے ایک مہ نوش حالات سے سمجھوتہ کرنے کے لئے اپنے وجود کو بھول بیٹھتا ہے۔

ناہید آج پہلی بار ثاقب کے گھر آئی۔ ثاقب ساتھ تھا۔ بنگلے میں گھستے ہی ہوا کے خنک تھپیڑے نے اُس کا خیر مقدم کیا۔ اُس کے سرکش بال رُخساروں پر منڈلا کر ناجائز فائدہ اُٹھانے میں مشغول ہوگئے۔ شریر لٹوں کو سنبھالتے ہوئے وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ دونوں ہال کمرے سے گزرتے ہوئے ڈرائنگ رُوم میں پہنچے۔ گھر میں دو ملازموں کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ دونوں ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے درمیان ثاقب نے محسوس کیا کہ ناہید بہت خوش ہے۔ وہ ایک پُرانے وضع کی تصویر کو بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اُس نے تمام تصویروں کو دیکھ ڈالا۔ وہاں سینریوں کے علاوہ کسی جاندار کی تصویر نہیں تھی۔

چائے سِپ کرنے کے دوران دو جوان دِل مچلنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے رہے۔ ثاقب ناہید کو دیگر کمرے دکھانے لگا۔ ہر کمرہ بے حد سلیقہ سے سجا ہوا تھا۔ دفعتاً ایک کمرے میں گھستے ہی ناہید ٹھٹک کر رہ گئی۔ اُس کی نظریں ایک فوٹو پر چپک سی گئیں ۔ ثاقب ناہید کو وہیں چھوڑ کر کسی کام سے کمرے کے باہر آ گیا۔

ناہید نے اپنے آپ کو آسمان سے گر کر دلدل میں دھنستے محسوس کیا۔ اُس کی زندگی کے نشیب و فراز طوفانی ناؤ سے کسی طرح کم نہ تھے۔ اُس نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایک نوجوان کو پسند کیا تھا۔ اسکول کا زمانہ تھا۔ اسکول میں دونوں کی قربت کے باعث ان کا ملنا جلنا عام تھا۔ طالب اُس سے ایک درجہ آگے تھا۔ اُس کے انٹر کرنے کے بعد ناہید نے بھی کالج جانا بند کر دیا۔ اُس کے دماغ میں نرس بن کر غریب و مزدور کی خدمت کرنے کا جذبہ سر اُبھارنے لگا۔ نرس بننے کا بھوت ایسا سوار ہوا کہ طالب کے سمجھانے پر بھی وہ اپنی ضد پر اڑی رہی ۔ طالب اپنی محبت کے آگے لاچار ہو کر رہ گیا۔ تھوڑی جدوجہد کے بعد ناہید اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی اور جذبۂ انسانیت کے تحت تن من سے خدمت خلق میں جُٹ گئی۔

ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اُسے کئی قسم کے حادثات سے دوچار ہونا پڑا۔ چند منچلے ڈاکٹر اور مکار قسم کے کامگاروں کی نظریں اُس کے گداز جسم کے اُتار چڑھاؤ پر برابر تھرکتی رہتی تھیں ۔ ناہید اُن نظروں کا مفہوم خوب سمجھتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ وہ اُن کی نظروں کے تعاقب میں اپنے وجود میں سمٹ کر رہ جاتی ۔ عوامی خدمات کا جذبہ ایک تلخ تجربہ ثابت ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ان تلخ اور ناہموار راہوں پر بھی شکیب و ہمت کے ساتھ قدم اُٹھاتی رہی، لیکن راون کی بستی میں سیتا کی حفاظت کرنے والے رام کو ہمیشہ کے لئے راستہ سے ہٹا دیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جابر و سنگ دل سماج سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکی۔ عام مریضوں کی خدمت کے شوق میں اپنی عفت و آبرو کو برباد کر بیٹھی۔

ثاقب نے کمرے میں قدم رکھتے ہی دیکھا کہ ناہید ایک فوٹو پر اپنی نگاہیں مرکوز کیئے ہوئے ہے۔ اُس نے تعارف کراتے ہوئے کہا، ''ناہید یہ میرے بڑے بھائی ہیں۔ ان کو ظالم سماج اور ایک حسین و جمیل ناگن صفت دوشیزہ نے ایسا ڈسا کہ میرا بازو ہی ٹوٹ گیا۔ اِنہیں اُس حسینہ سے حد درجہ محبت تھی۔ اُس کی الفت میں سرشار یہ اُس کی ہر بات مان لیا کرتے تھے۔ اُس کی ہر ضد کے سامنے سرنگوں ہو جایا کرتے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ اُسے نرس بننے کے شوق نے بے خود و بے قابو کر دیا۔ مریضوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کو دُور کرنے کے لئے اُس نرس کی ضد نے اُس وفا کے پیکر کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالا۔ میرا بھائی اسپتال کے ماحول سے واقف تھا۔ وہ یہ دیکھنا گوارہ نہ کر سکا کہ اُس کی محبوبہ کی جانب کوئی غلط نگاہ اُٹھے۔ کوئی اُس کی عزت پر دست دراز ہو یا آبرو پر ڈاکہ ڈالے۔ دُشمنوں نے اُس کے بھائی کو راستے سے ہٹا دیا۔ میرا بھائی اپنی محبوبہ کی ضد پر قربان ہو گیا۔''

ناہید!! اگر وہ نرس کی بچی مجھے مِل جائے تو اُس سے یہ ضرور پوچھوں گا کہ کیا وہ آج بھی ویسی ہی پاک دامن ہے، جیسا کہ میرے بھائی کی زندگی میں تھی؟ اگر نہیں...... تو میرے بھائی نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ اپنی ضد کے آگے اُسے کیوں بلیدان کر ڈالا؟

مجھے اُس سے نفرت ہے۔ ناہید! وہ نرس نہیں! نرس کے لبادے میں ناگن ہے!! دو رُوپ ہیں اُس بے وفا کے۔ اُس کا ایک بھیانک رُوپ ڈاکو جیسا ہے، جس نے میرے بھائی کو لُوٹا اور دوسری صورت میں وہ خود بھی لُٹ کر رہ گئی۔

آؤ ناہید! چلیں!! میں نہیں چاہتا کہ میری گڑیا جیسی ناہید پر اُس منحوس نرس کا سایہ پڑے اور میں بھی اپنے بھائی جیسے انجام کو پہنچ جاؤں۔

○○
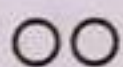
(جولائی ۱۹۷۶ء)

احساس

پرواہ! اور وہ بھی بُرے وقت میں!! اس کا احساس اُسے تب ہوا، جب آذر کو اُس سے جدا کر دیا گیا۔ وہ غریب چارپائی پر پڑی ہر نظر کرم کی منتظر موت وغم کے سائے اپنے اردگرد دیکھ رہی تھی۔ اُس کا اِس جہاں میں ماں کے سوا کوئی نہ تھا۔ وہ پانچ برس کی تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ اب ماں ہی اُس کے لئے سب کچھ تھی۔ اس نے میٹرک پاس کرلیا تھا اور ایک مشرقی لڑکی کی طرح پڑھائی ترک کر کے گھر کے کام کاج میں ماں کا ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ وہ فیشن سے گریز کرتی تھی۔ اُس نے کبھی کریم، پاؤڈر اور لپس اسٹک کو چھوا تک نہیں تھا۔ اس کے باوجود اُس کا سُرخ چہرہ گلاب کی پتیوں کی طرح دمکتا تھا۔ گول گول سحر انگیز آنکھیں ہر طرف جادو بکھیرتی جاتی تھیں۔ اُن میں کچھ اس طرح کی اپنائیت تھی کہ جو کوئی اُن کو ایک بار دیکھ لیتا تھا، ان کا اُسیر ہو کر رہ جاتا تھا۔ نقرئی ہونٹوں کا تراش بڑا خوبصورت لگتا تھا۔ پُرصحت بدن کے مناسب اُبھار جسم میں گدگدی پیدا کر دیتے تھے۔ لیکن.....آج وہ حسن مجسم نہ تھا۔ چہرے کی شادابی کے برعکس اُبھری ہڈیوں کے نقوش کا ایک ڈھانچہ بھر تھا۔ آنکھوں کا جادو ماند پڑ چکا تھا۔ ہونٹوں کی خوبصورتی نام کو بھی باقی نہیں رہی تھی۔ ہاتھ اور پاؤں ہی کیا، سرتا پا وہ نحیف و سپید پڑ گئی تھی۔ اُس کے سڈول جسم کی گولائیاں بے جان ہو کر اپنی خوبصورتی کھو چکی تھیں۔

اُس کی آرزو و تمناؤں کا خون ہو چکا تھا۔ اُس کے احساس نے اُسے جیتے جی

ڈس لیا تھا۔وہ عیش و مسرت کے مسرور کن لمحات سے لطف اندوز ہونے کی بجائے موت کی گھڑیاں گن رہی تھی۔اُس کی خواہش کا گلا تو اُس وقت گھونٹ دیا گیا تھا، جب میر صاحب نے بڑے فخر کے ساتھ یہ اعلان کیا تھا کہ آذر کی شادی شاذی سے نہیں، بلکہ شہر کے جج صاحب کی اکلوتی اور ماڈرن بیٹی گلزار کے ساتھ ہوگی۔گھر کے سبھی افراد پتھر بنے کھڑے تھے۔کسی میں لب کشائی کی جرأت نہ تھی۔یہ سوچے بغیر کون رہ سکتا تھا کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہوگیا؟

بات بالکل صاف تھی۔ہر کسی کے دماغ میں یہ بات رچ بس گئی تھی کہ میر صاحب نے لالچ میں آکر یہ فیصلہ کر ڈالا ہے۔جہیز کی ہوس نے اُن کی آنکھوں کو چکاچوند کر دیا ہے۔جج صاحب سے ملنے میں اُن کا سینہ لگ بھگ دو انگل پھول سا گیا تھا۔وہ بڑے خوش تھے۔بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔اُن کے گھر میں جج صاحب کی بیٹی بہو بن کر آ رہی تھی۔وہ خوبصورت، فیشن ایبل اور گریجویٹ ہونے کے ساتھ نجی بینک بیلنس کی مالک بھی تھی۔

منگنی کی رسم ادا ہوگئی۔میر صاحب خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔اِتنے اچھے رشتہ کی اُنہیں توقع نہ تھی۔گلزار کا فوٹو دیکھ دیکھ کر ہر کوئی اپنے ہوش گنوا رہا تھا۔گول چہرہ، چاندی سا بدن، بڑی بڑی آنکھیں ،کاغذی ہونٹ اور اُن پر شوخ سا تبسم،سیاہ گھنے بال، گلے میں ہیرے جڑا نیکلس۔پیکرِ حسن ہر دِل کو جیت رہا تھا۔ہر کوئی اس کا دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔سبھی کے دل میں یہ ارمان وفورِ جذبات سے ٹھاٹیں مار رہا تھا کہ گلزار ہی اس گھر کی بہو بننے کے لائق ہے۔لیکن وہ گلدستۂ حسن تمام دُنیا جس کی پوجا کر رہی تھی، آذر کو ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔اُسے اس چہرے میں بناوٹ کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔اُسے بار بار اُس فوٹو کو دیکھ کر شاذی کا خیال آ رہا تھا۔اُس شاذی کا جو اُس کے دل و دماغ پر بُری طرح چھائی ہوئی تھی۔اُس کی آنکھیں آج بھی وہ منظر نہیں بھول پا رہی تھیں، جب وہ ایک مہلک مرض میں کھاٹ کی پٹی کے سہارے اُٹھتا بیٹھتا تھا۔دُنیا بھر کی گولیاں اور پھنکیاں اُس کا مقدر ہو چکی تھیں۔ ہر کوئی

بیزار و پریشان تھا۔ کسی کو اُس کے بچنے کی رتی بھر بھی آس نہ رہی تھی۔ پیر، فقیر، حکیم ، وید اور ڈاکٹر ایک طرح سے اپنی ہار مانتے ہوئے طرح طرح کے مشورے دے رہے تھے، لیکن بے فیض! کوئی دوا کارگر نہ ہوئی!! کوئی دُعا پُر اثر نہ ہوئی۔ گھر کے تمام افراد اطبّا کے مشوروں سے عاجز آ چکے تھے۔ میر صاحب کو بیٹے کی شادی کا بچکانہ مشورہ دے کر آخری ہتھیار استعمال کیا جا رہا تھا۔ بھلا سوچیے! جو خود دوسروں کے سہارے اُٹھ بیٹھ رہا ہو۔ جس کے بدن پر گوشت برائے نام ہی رہ گیا ہو۔ جس کے چہرے پر وحشت برس رہی ہو۔ اُس سے اِس حالت میں اپنی پیاری بیٹی کو بیاہنے کی کون حامی بھر سکتا تھا؟ کون ایسی پاگل لڑکی ہوگی، جو لاعلاج بیمار کے ساتھ شادی کرنے کے لئے رضامند ہو جاتی؟ لیکن ایک ایسی عورت بھی تھی، جو ایک نوجوان کی زندگی بچانے کے لئے اپنی بیٹی کا رشتہ بیمار آذر کے ساتھ منسوب کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔

کسی غرض سے نہیں، بلکہ انسانیت کے ناطے۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ اطبّا کا کہنا ہے کہ آذر کی زندگی اَب اگر بچ سکتی ہے، تو صرف ازدواجی زندگی سے، ورنہ نہیں۔ آذر نام کے ہڈیوں کے ڈھانچے سے کوئی شخص اپنی لڑکی کی شادی کرنے کو تیار نہیں ہے۔ میر صاحب بھی روپے پیسوں سے ایک عدد بہو پیدا نہیں کر سکتے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے۔ اس صورت میں ایک غریب ماں نے بیمار آذر کے لئے اپنی لاڈلی گڑیا کو داؤ پر لگانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

میر صاحب نے جب یہ سنا، تو ان کے آنگن میں بہار کا جھونکا سا آ گیا۔ اُنہیں اپنی زندگی میں خوشی لوٹتی نظر آئی۔ اُنہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا ممکن ہے۔ لیکن دولت کی اکڑ اور نشے میں چُور رہنے والے مغموم قلب کو غریب گھر کے سائے میں سکون مل گیا تھا۔ میر صاحب تو اپنی بازی ہار چکے تھے۔ ان کی شان و شوکت اور دھن دولت ناکام ثابت ہو چکی تھی۔ اَب جو کچھ بھی تھا، وہ شاذیہ کی خدمت و دُعاؤں کا اثر تھا یا پھر ایک افلاس زدہ ماں کی امید کا پھل، ورنہ آذر کو تو کئی بار موت کے سخت جان پنجے اپنی شہ رگ کے قریب نظر آ چکے تھے۔ کئی بار دَم نکلنے کا احساس ہو چکا تھا۔ لیکن

اَب اُس میں زندگی کے آثار پھر سے نمایاں ہو چکے تھے۔اُس کے لبوں پر مسکان تھرکنے لگی تھی۔ خالق دو جہاں کو شاید بے چاری شاذؔی پر ترس آگیا تھا۔

آذؔر تیزی سے تندرست ہوتا جا رہا تھا۔روز بہ روز اُس کے بدن میں طاقت و توانائی آرہی تھی۔ میر صاحب کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔اُن کا گلشن دوبارہ آباد ہو رہا تھا۔ہر کوئی شاداں و خنداں تھا۔شاذؔی تو پاگل سی ہو گئی تھی۔اُس کا چہرہ ہی نہیں دِل بھی کھلا جا رہا تھا۔

نئی زندگی پا کر آذؔر اپنی محبوب کے کچھ اور قریب آگیا۔وہ جانتا تھا کہ اُس کا یہ رُوپ صرف اُس کی بدولت ہے۔آج وہ زندہ ہے،تو صرف اس کی دُعا و خدمت کے طفیل ، ورنہ موت و زندگی کی اس طویل مدتی جنگ میں زیست کو یقینی طور پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا۔

شاذؔی کی عظیم الفت آذؔر کے دل و دماغ میں پروان چڑھ رہی تھی۔وہ اپنے خیالات میں گھنٹوں گھنٹوں گُم صم بیٹھا مستقبل کا خاکہ بناتا رہتا۔اُس کا دِل شاذؔی کے نام پر دھک دھک کرنے لگتا۔اُس کے ذکر پر وہ کچھ تلاش سا کرنے لگتا۔آخر کرتا بھی کیوں نہیں؟اِس قابل قدر ہستی سے تو اُس کی منگنی اُس حالت میں کر دی گئی تھی،جب وہ ایک زندہ لاش تھا۔یہ شاذؔی کی ہمت ہی تھی،جس نے ایک نحیف الجثہ سے ہمدردی کا اظہار ہی نہیں کیا،بلکہ اپنی تیمارداری سے مردہ جسم میں جان ڈال دی۔ورنہ کون جان بوجھ کر اپنے آپ کو گڈھے میں گرانا پسند کرتا ہے؟

جانے کیوں شاذؔی کو یہ خوشی راس نہ آئی۔اُس نے سب کچھ آذؔر پر قربان کر کے اُس کی زندگی تو بچالی،لیکن خود بیمار رہنے لگی ۔غربت کے احساس نے اُسے بیمار کر دیا۔ بیمار بھی ایسی جو کبھی ٹھیک نہ ہو سکے گی ۔آذؔر کی محبت میں کسی طرح کا فرق نہیں آیا۔اُس نے اُس غریب سے کبھی منھ نہیں موڑا۔ ہر دم اس کی دیکھ بھال میں لگے رہنا اپنا معمول بنالیا۔

میر صاحب جو کبھی شاذؔی کا ہی دم بھرتے تھے،اَب قریب قریب اُسے نظر

انداز کر چکے تھے۔ وہ شاذی جسے اپنے گھر کی بہو بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے، اَب اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ گھر کے وہی لوگ جو آذر کی بیماری کی حالت میں شاذی سے منگنی ہونے پر اُس کے گیت اَلاپا کرتے تھے، اَب اُسے یکسر بھلا بیٹھے تھے۔ کسی کو اُس کی قربانی کا چٹکی بھر احساس نہیں تھا۔ اگر احساس تھا، تو صرف آذر کو، لیکن اُس کے احساس کرنے سے بھی کیا ہوتا؟ دُکھ درد میں شامل ہونے سے بھی کیا بنتا؟ اُس میں باپ کی مرضی کے خلاف جانے یا انارکلی کے لئے سلیم کی طرح بغاوت کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ کچھ نہیں کر سکا۔ صرف دیکھتا ہی رہ گیا۔

آذر کا رشتہ جج صاحب کی بیٹی گلزار سے منسوب ہو گیا۔ اُس کے دِل پر کیا گزری ہوگی، جس نے آذر کو اپنا سب کچھ مان لیا تھا۔ دُنیا و سماج سے سرکشی کی۔ طرح طرح کے طعنے سنے۔ لوگوں کے تیرو طنز سہے، لیکن جس زندہ لاش کو وہ قبول کر چکی تھی، اُسے کس طرح الگ کر دیتی؟ جب اُس نے آذر اور گلزار کی نسبت کی بابت سُنا ہوگا، تو کیا بیت رہی ہوگی اُس پر۔ اس کا احساس بھی آذر کے علاوہ کسی اور کو نہیں تھا۔ اس احساس نے اُسے بری طرح جھنجوڑ دیا۔

آذر نے پہلی بار باپ کے سامنے لب کشائی کی جرأت کی، ''ابا حضور! جب میں بیمار اور کمزور تھا۔ ہاتھ اُٹھا نہیں سکتا تھا۔ پیروں سے چل نہیں سکتا تھا۔ ٹھیک سے بول نہیں پاتا تھا۔ جب میں ہڈیوں کا صرف ڈھانچہ بھر تھا۔ ایک وحشت زدہ زندہ لاش تھا، تب آپ کی شان و شوکت اور عزت و دولت مجھے ٹھیک نہ کر سکی تھی۔ شاذی کی تیمارداری، پیار اور قربانی نے میرے بے جان جسم میں نئی رُوح پھونکی۔ آج اگر اس کے برعکس ہو گیا، تو آپ اُسے ٹھکرا رہے ہیں۔ آپ یہ کیوں بھول گئے کہ کل میں بھی بیمار تھا اور اس سے بھی بدتر حالت میں تھا۔ آپ کو تو ایسے میں اُس سے بے پناہ ہمدردی ہونی چاہئے تھی۔ آپ........''

''بس! خبردار!! جو آگے ذرا بھی زبان کھولی۔ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ مجھے سکھانے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارا باپ ہوں۔ میں نے دُنیا دیکھی ہے

۔اس کے رنگ رُوپ میں اچھی طرح تپ چکا ہوں۔تم یہ کیوں بھول گئے کہ جب وہ تندرست تھی،تو غریب بھی تھی۔آج اگر وہ ایک جاندار لاش ہے،تو غربت بھی اُس کے ساتھ قدم تال کر رہی ہے۔تمہاری اور اُس کی بیماری میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔لوگ کل تک اُسے لعن طعن کرتے تھے کہ شاذیؔ کی ماں نے آذر سے نہیں ، دولت کے ساتھ منگنی کی ہے۔آج دُنیا مجھے کیا کہے گی؟ اگر تمہاری زندگی کا سوال نہ ہوتا،تو میں اُس بھکارن کی بیٹی کے ساتھ تمہاری منگنی کبھی نہیں کرتا۔کان کھول کر سن لو۔ ہمارے خاندان میں ماں باپ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوتا۔نہ کبھی ہوا ہے اور نہ کبھی ہوگا!!!'' میر صاحب نے اپنے دل و دماغ میں پھنسا تمام غبار باہر نکال دیا۔

لاچار و بے بس آذؔر تلملا کر رہ گیا۔وہ شاذیؔ کو اُس کا پیار نہ دے سکا۔اُس کے دل سے غربت کا احساس نہیں نکال سکا۔اُسے یہ نہیں جتا سکا کہ وہ اُس کی ہے، صرف اس کی۔اُس پر صرف اور صرف اُس کا ہی حق ہے۔وہ اس کے سیاہ سفید کی مالک ہے۔

آخرکار آذؔر کے پاؤں میں زوجیت کی زنجیر ڈال دی گئی۔میر صاحب کے یہاں خوشیاں عروج پر تھیں۔اُدھر وصل کی شب مفلس دوشیزہ کی بیماری کا علاج ہوگیا۔شاذیؔ کے چہرے پر تازگی اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ چارپائی پر پڑی بے جان لاڈلی کے چہرے کو چادر سے ڈھکتے وقت ایک مجبور و بیکس ماں کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

○○
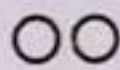
(جولائی ۱۹۷۵ء)

پانچواں رُوپ

اندر قدم رکھتے ہی وہ گھبرا گیا۔عورت کی شکل جانی پہچانی لگ رہی تھی۔وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا،مگر عقل کام نہیں کر رہی تھی۔سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب ہو گئی تھی۔تبھی خاتون نے کہا کیا سوچ رہے ہو نجمی؟ وہ اپنا نام سن کر مزید چونک گیا۔دھیرے دھیرے اس کا تجسس بڑھتا رہا اور ماضی کا گدلا قرطاس اس کے سامنے پھیلتا چلا گیا۔وہ قرطاس جس پر جگہ جگہ پڑ گئے دھبوں نے ڈیرا جما لیا تھا۔وہ داغ جو گناہوں کے تھے!!

دراصل گناہوں کے ان دھبوں کی ابتدا تو اُسی دن سے ہو گئی تھی،جس روز اس نے بہن کے پاک بندھن کو توڑتے ہوئے شمیمہ کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیا تھا۔اور اس سے کہا تھا،''شمی تم دُور کے رشتہ میں بہن لگتی ہو لیکن میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔محبت کرتا ہوں تم سے۔دل و جان سے چاہتا ہوں تمہیں۔تم مجھے بے حد عزیز ہو۔میں تمہارے بغیر جی نہیں سکتا۔اب پَل بھر بھی ضبط نہیں کر سکتا۔حالات یہاں تک پہنچ گئے کہ نجمی کی پُر کیف آنکھوں میں محبت و اعتماد کی گہرائیاں دیکھ کر ایک بے کس لڑکی رشتہ کی بہن سے محبوبہ بن نے پر مجبور ہو گئی۔کچھ دنوں پیار و محبت کا سلسلہ چلا اور پھر نکاح کے بعد ازدواجی زندگی میں داخل ہو گئے۔

زندگی کے نئے پڑاؤ میں وہ نجمی کی بیوی تھی۔اُس کی شریک حیات اور دُکھ سُکھ کی ساتھی،لیکن یہ ازدواجی زندگی اُسے راس نہیں آئی۔جلدی ہی حقیقت سامنے

آ گئی ۔شمی ایسی شریک حیات نہیں تھی، جسے ازدواجی زندگی میں چین وسکون میسر ہوتا ہے۔ وہ شریک حیات تھی اُس خاوند کی، اب جس کے ہاتھ اُٹھتے تھے،تو صرف مارنے پیٹنے کے لئے ۔ آنکھیں اُٹھتی تھیں،تو آگ کے شعلے برسانے کے لئے۔زبان کھلتی تھی،تو بدکلامی اور بُرا بھلا کہنے کے لئے۔ پاؤں اُٹھتے تھے،تو ٹھوکر مارنے کے لئے۔ نجمی کے پیارومحبت کا ملمع بہت جلدی ہی اُتر چکا تھا،لیکن وہ خاموش رہتی تھی۔شوہر کی زیادتیوں کو برداشت کرنے کو بھی اپنا فرض سمجھتی تھی ۔اُسے امید تھی کہ آج نہیں تو کل اُسے عقل سلیم آجائے گی اور وہ سیدھے راستے پر آجائے گا۔لیکن ایسا ہونہیں پایا۔

نجمی شرابی تھا۔ دیر رات کو واپس آتا اور جب آتا تب شراب کے نشہ میں دُھت ہوتا۔اتنے پر بھی وہ خاموش نہیں رہتا۔خوب شور شرابہ کرتا۔گالیوں سے نوازتا اور دُنیا بھر کی بکواس کرتا۔وہ خاوند کو سمجھانے کی کوشش کرتی،تو اس بیچاری،غم کی ماری اور دکھیاری کوشوہر کے ہاتھوں مار کھانی پڑتی۔وہ شوہر کی مار کو عاشق کی مار سمجھ کر چپ ہو جایا کرتی۔وہ اس لئے بھی خاموش رہتی کہ اگر اُس نے اپنی زبان سے اُف بھی کی،تو بدن پر مار پیٹ کے نیل تو پڑیں گے ہی،محلہ والوں کی رات کی نیند بھی حرام ہو جائے گی۔وہ تمام ظلم وستم برداشت کرتی رہی۔اندر ہی اندراس کا دِل روتا تھا،لیکن وہ ضبط کرتی رہی۔کبھی کبھی اُس کے قدم شاہراہ کی جانب اُٹھنا چاہتے ،لیکن وہ اپنے اُوپر قابو پائے رہی۔

نجمی کو وہ دن بھی یاد آیا۔خوشی کا دن!عید کا دن!! جب گھر میں قدم رکھتے ہی اس کی نظر شمی پر پڑی،جو سُرخ چکن کے جوڑے میں ملبوس کب سے اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔شوہر کو دیکھ کر اُس کا چہرہ گلاب کی مانند کھل گیا،لیکن چہرے کی شادابی زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔نجمی کچھ دیر کے لئے اپنے شرابی کبابی دوستوں سے چھٹکارا پاکر بیوی سے اس کا زیور لینے آیا تھا۔شراب کے لئے! اُسے تو ہر حال میں شراب چاہئے تھی!!وہ شراب پینے کا عادی تھا،لیکن دوستوں میں بیٹھ کر۔اس کی خوشی شراب میں تھی۔عید کا مزہ آب گل رنگ میں تھا۔شمی اگر شوہر کے انتظار میں بیٹھی ہے،تو بیٹھی

رہے۔اُسے اس سے کیا مطلب ؟ بڑے تلخ لہجہ میں اُس نے زبان کھولی،''کیوں؟ کس کی یاد میں آج دلھن بنی بیٹھی ہو؟کسی کا انتظار ہے کیا؟ جواب میں شمی نے شوہر کے پاؤں پکڑ لئے۔اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوں گرنے لگے اور خاموش نظریں کہنے لگیں،''نجمی میں تمہارے علاوہ بھلا کس کا انتظار کر سکتی ہوں ؟میرے سرتاج! میرا کون ہے تمہارے سوا؟

آوارہ،شرابی شوہر نے شمی کے جذبات کی قدر نہ کی۔اُس نے وہی سب کچھ کہا،جو اس طرح کا شرابی و کبابی شخص کہہ سکتا تھا۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔تم سے میرا کوئی رشتہ نہیں!کوئی واسطہ نہیں!!نکل جاؤ میرے گھر سے!!! میں تمہیں اپنے گھر میں دیکھنا نہیں چاہتا۔

''اب اتنی نفرت ہوگئی ہے مجھ سے۔''بس اتنا ہی کہہ پائی تھی شمی کہ اس کے گال پر تڑاخ سے تھپڑ پڑا اور وہ زمین پر گر گئی۔اُسے گمان بھی نہ تھا کہ ایک روز اس طرح کے الفاظ بھی سننے کی نوبت آئے گی،جو دو دلوں کے بیچ دُوری پیدا کر دیتے ہیں۔اُس کے ذہن میں خیالات کی آندھی چل نکلی اور وہ تخیلات کے بھنور میں چکر کھاتی ہوئی سڑک پر دوڑنے لگی۔کیا عورت کی تخلیق اسی لئے کی گئی ہے کہ وہ مرد کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بنی رہے۔مرد اُسے اپنی غلام اور پیر کی ایسی جوتی سمجھے،جسے جب چاہے پہن لے اور جب جی چاہے تب نکال کر پھینک دے۔کیا اب چاند بی بی،لکشمی بائی اور اندرا گاندھی جیسی باہمت خاتون کی تخلیق نہیں ہوگی۔نہیں! ایسا نہیں ہوگا!! عورت کے کئی رُوپ ہیں۔ماں،،بہن،بیوی اور بیٹی!! کیا نجمی ان راہوں سے نہیں گزرا، جہاں ان کے دیدار ہوتے ہیں؟نجمی تم نے شاید ماں کو ماں نہیں جانا۔اس کی عظمت اور تقدیس کو تم بھول گئے۔بہن کی عصمت و محبت کو تم نے ٹھوکر ماردی۔ بیوی کے پیار اور اعتبار کو تم نے ذلیل و رسوا کر دیا۔اور بیٹی کی ممتا......نہیں!! یہ بیٹی صرف تمہاری ہی نہیں میری بھی ہے۔اِس نے میری کوکھ سے جنم لیا ہے۔میں نے اسے نو مہینے پیٹ میں رکھا ہے۔دردِ زہ کو جھیلا ہے میں نے۔یہ میرے دِل کا ٹکڑا ہے۔دو

برس تک میں نے اسے اپنا دُودھ پلایا ہے۔ اسے سدا اپنے سینے سے لگا کر رکھوں گی۔ تم جیسے شرابی باپ کی قربت تو قربت سائے تک سے بھی اِسے دُور رکھوں گی۔

تم نے مجھے گھر سے نکالا ہے۔ اس گھر کے دروازے میرے لئے بند ہو گئے ہیں۔ کہیں بھی رہ لوں گی میں اپنی بیٹی کے ساتھ۔ یہ دُنیا بہت بڑی ہے۔ اتنا کہنے کے بعد شمی نے اپنی تین سالہ بیٹی کا ہاتھ پکڑا اور گھر سے باہر آ گئی۔ اب شمی کا گھر اوڑھنا بچھونا سب کچھ فٹ پاتھ تھا۔ وہ چلتے چلتے تھک گئی تھی۔ ہائے رے نصیب کہتی ہوئی ایک جگہ فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی۔ بیٹی کی انگلی اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ خیالوں کا سمندر اس کے سامنے تھا۔ ایسا سمندر جس میں پاکیزگی کم اور گندگی زیادہ تھی۔ فٹ پاتھ کے ماحول میں تو پاکیزگی کا سوال ہی نہیں تھا۔ فٹ پاتھ تو ہمیشہ سے لوگوں کی نظروں کا نشانہ رہا ہے۔ گندگی اور گھناؤنی دُنیا!! یہاں عورت کو ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے رُوپ میں نہیں دیکھا جاتا۔ یہاں عورت کو جس رُوپ میں دیکھا اور سمجھا جاتا ہے، اُسے اس کا پانچواں رُوپ کہا جاتا ہے۔ ماں، بہن، بیٹی اور بیوی سے الگ کا یہ رُوپ، جو پیار کی خوگر اور عفت کی پیکر عورت کو طوائف بنا دیتا ہے۔ ایک گھریلو خاتون سے الگ کی اس زندگی کو ایک ویشیا سے زیادہ کون جان سکتا ہے؟

مرد کی داستان کتنی عجیب ہے! واقعی، بہت عجیب ہے یہ مرد!! وہی مرد جو ماں کی ممتا اور اس کی عظمت کو ٹھکرا دیتا ہے، اِس رُوپ کا پُجاری ہو جاتا ہے۔ وہی بھائی جو بہن کی رتی بھر پرواہ نہیں کرتا، اِس رُوپ کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے۔ وہی شوہر جو بیوی کو اپنے پیر کی جوتی سمجھتا ہے، اِس رُوپ کے روبرو خود جوتا بن جاتا ہے۔ وہی باپ جو بیٹی پر پیار کی نگاہ تک نہیں ڈالتا، اِس رُوپ کے سامنے اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ کتنا خود غرض ہے یہ مرد!!

اپنی بیٹی کے لئے وہ بھی اسی رُوپ کو اپنائے گی۔ نجمہ کی حفاظت اور اس کے مستقبل کے لئے وہ سب کچھ کرے گی، جو ضروری ہے۔ اُس نے اپنا وعدہ پورا بھی کیا۔ زندہ رہنے کے لئے اس نے کوٹھے کا رُخ کیا اور خوب سوچ سمجھ کر ناچ گانے کا

دھندہ اپنا لیا۔اسی کے ساتھ قریب بارہ برس تک وہ اپنی بیٹی کو لوگوں کی بدنگاہوں سے بچائے رکھنے میں بھی کامیاب رہی۔جب نجمہ نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا اور وہ پندرہوں برس کو پار کرنے لگی،تب اس کے پاس ڈھیر سارے سرخ چکن کے جوڑے، سونے کے زیورات اور بڑی مقدار میں رقم موجود تھی۔اَب وہ بیوفا شوہر نجمی کا تصور بھی نہیں کرتی تھی۔وہ اس کے بارے میں سوچتی بھی کیوں؟ ویشیا کے رُوپ والی ناپسندیدہ زندگی میں اُسے جو سکون ملا،وہ نجمی کے ساتھ کی ازدواجی زندگی میں کبھی میسر نہیں آیا۔

ناچ گانے کے شوقین لوگوں نے جب یہ اعلان سنا کہ آج چمپا بائی کے کوٹھے پر ایک خوبصورت اور نازک کلی پہلی بار جلوہ کناں ہوگی،تب اور دنوں کے مقابلے رنگین مزاج لوگوں کا بڑا ہجوم اُس کے کوٹھے پر جمع ہوگیا۔مجرا ختم ہونے تک اس کے قدموں میں ڈھیر سارے نوٹ اور زیورات پڑے تھے۔واہ،واہ! آفریں،صد آفریں!! کی بلند صداؤں کے ساتھ لوگ نجمہ کے نغمہ اور دلفریب اداؤں کی تعریف کرتے نہیں تھک رہے تھے۔رفتہ رفتہ ایک ایک کر سب دیوانے اُٹھ کر چلے گئے۔نجمی جو بہت دیر سے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا،بھی دروازے سے باہر آنکل آیا۔دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی اُسے یاد آگیا کہ وہ اس عورت کو جانتا ہے۔اُس نے اِسے پہلے کہیں دیکھا ہے۔یہی خیال کر وہ واپس اندر کی جانب پلٹ گیا۔وہ شکل واقعی جانی پہچانی تھی۔وہ خاموش کھڑا کچھ سوچ رہا تھا،تبھی شمی نے اُس کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔

نجمی! تم........اوہو!!......میں سمجھ گئی!!.......تم بھی اس لڑکی کی شہرت سن کر یہاں آئے ہوں گے۔ملاقات کرنا چاہتے ہو اُس سے! اَبھی بلاتی ہوں!! اور اِسی کے ساتھ اُس نے نجمہ کو آواز لگائی۔نجمہ! بیٹی نجمہ!! تم بار بار مجھ سے سوال کیا کرتی تھی، ''میرا باپ کون ہے؟ کہاں ہے؟ کب آئے گا؟ لے، آگیا تیرا باپ! تیرا باپ آگیا!! جی بھر کر دیکھ لے اپنے باپ کو!!! لیکن.......میں تجھ پر ان کا سایا بھی نہیں پڑنے دوں گی۔ان کی آنکھوں میں وفا،محبت،ہمدردی اور ایثار نام کا نشان تک نہیں ہے!! فرض

نبھانا یہ جانتے نہیں اور پیار!! پیار نام کا کوئی آنسوان کے پاس ہے نہیں!!!"

پانچویں رُوپ کی گھناؤنی صورت سیم وزر کی کھڑکی سے نجمی کو گھور رہی تھی اور وہ بیٹی کی جانب نگاہ اُٹھائے بغیر بلک بلک کر رو رہا تھا۔

○○

(فروری ۱۹۷۳ء)

کھوٹے سکّے

شوبھا، سارے اسپتال کی شوبھا بنی ہوئی تھی۔ ہر فرد کی آنکھیں اس کے چہرے پر مرکوز ہوئے بنا نہیں رہ پاتی تھیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ گول چہرہ، باریک ناک، کاغذی ہونٹ، جھیل کی مانند گہری آنکھیں، ٹھوڑی پر سیاہ خال، لمبے گھنے بال اور لب پے تبسم!! یعنی کسی بھی ہوش مند کو آپے سے باہر کرنے کا مکمل سامان!!!

ہوا بھی یہی، جب سے شوبھا کے قدم اسپتال میں پڑے، تبھی سے ہر کوئی اس کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ ہر ایک کے لب پر شوبھا ہی شوبھا تھا۔ اسپتال میں کون تھا جو شوبھا کا دیوانہ نہ ہو؟ کون تھا جو شوبھا کے خواب نہ دیکھتا ہو؟ لیکن اس سب کے باوجود ایک ایسا ڈاکٹر بھی تھا، جس کی زبان نے کبھی شوبھا کے نام کا وظیفہ نہیں پڑھا۔ اُس کے لئے شوبھا بھی ان ہی نرسوں جیسی تھی، جیسی کہ اسپتال کی دیگر نرسیں گیتا، نندی، اُرملا اور رضیہ وغیرہ۔ اس کے لئے شوبھا میں کوئی انوکھا پن نہیں تھا۔ وہ بھی ان ہی کی طرح نوجوان اور خوبصورت تھی۔ فرق تھا تو بس اتنا کہ اُسے اسپتال میں آئے ہوئے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے۔

جوانی، قبول صورت، ہونٹوں پہ تبسم اور بات چیت کا رس بھرا انداز تو نرس کا زیور ہوتا ہے۔ اسی سے مریض کا آدھا روگ دُور ہو جاتا ہے۔ یہ زیور شوبھا کے پاس بھی تھا۔ جوش، لگن، ہمت اور خوش مزاجی کی اس کے پاس کمی نہ تھی۔ کام کرتے ہوئے وہ کبھی تھکتی نہ تھی۔ مریضوں کے ساتھ انسیت اور وقت پر دوا دارو دینا اپنا فرض سمجھتی تھی

،لیکن ان سب کے باوجود بھی وہ اس بات کو محسوس کرنے سے بھی باز نہ رہ سکی کہ ڈاکٹر کشن کو دوسرے ڈاکٹروں کی طرح اس میں قطعی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ حقیقت اُس کے ذہن و دل میں گھر کر گئی ۔اُس نے اپنے وجود میں سمٹ کر کئی بار اس کا جائزہ بھی لیا،لیکن اُسے کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی ،جس سے فرق واضح ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کچھ کھوئی کھوئی سی رہ کر تلاشِ وجہ کی طرف اپنے قدم بڑھانے لگی۔

شوبھا کی خوشی کی انتہا نہ رہی، جب اُسے علم ہوا کہ آج کے آپریشن میں اُسے ڈاکٹر کشن کے ساتھ رہنا ہے ۔اُس نے تہیّہ کر لیا کہ آج وہ اپنے کئی ہتھکنڈے آزمائے گی اور دیکھے گی کہ ان میں ایسی کیا بات ہے جو وہ اُس کی طرف سے بے نیاز ہیں، جبکہ دیگر کئی ڈاکٹر اس سے بے وجہ بھی گفتگو کرتے رہتے ہیں۔کیا وہ وقت کے ستائے ہوئے ہیں؟ کیا اُنہیں کسی لڑکی نے دھوکا دیا ہے؟ کیا وہ کسی کو اپنا بنانے کے باوجود بھی اسے اپنا نہیں بنا سکے؟ کیا اُنہیں کسی طرح کا صدمہ ہے؟ اس طرح کے انگنت سوال اس کے ذہنی پردے پر چپکنے لگے۔

آئینہ کے سامنے کھڑی شوبھا نے اپنے چہرے کے عکس کو نہارا۔دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔اُسے اپنے دل میں ایک کسک سی محسوس ہوئی۔خود بہ خود اس کے دل میں محبت کے سوتے پھوٹنے لگے۔اُسے ایسا لگا جیسے وہ ڈاکٹر کشن سے محبت کرنے لگی ہے۔ کشن کے نام پر اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔فرطِ خوشی سے اس کا دل جھوم جھوم اُٹھا۔وہ اب آنے والی اُن ساعتوں کی منتظر تھی، جن میں اُسے کشن کی قربت حاصل ہونے والی تھی۔

آپریشن تھیٹر میں پہلا موقعہ تھا، جو اُسے کشن کے بہت نزدیک لے آیا۔مریض کا آپریشن ہو گیا۔اس کے ساتھ تمام تلخ تجربات ذہنی پلاؤ کی طرح بے بنیاد ثابت ہوئے۔ ڈاکٹر کشن کی بابت اب تک جو خیالات اُس کے ذہن میں اُجاگر ہوئے تھے، وہ قریب قریب بے معنی ثابت ہوئے۔ان کی بے تکلفی دیکھ کر اُسے کئی بار ایسا لگا کہ یہ ڈاکٹر کشن نہیں، بلکہ ڈاکٹر پوری ہیں، ڈاکٹر ونود ہیں، ڈاکٹر......مگر وہ تو کشن ہی

تھے، ڈاکٹر کشن۔ اُن کی باتوں میں خلوص تھا، اپنائیت تھی، بھروسہ تھا، ہمت تھی۔

وہ اسپتال سے گھر آ گئی، لیکن اُسے ایسا لگا کہ ڈاکٹر کشن اب بھی اس کے پاس ہے۔ بہت نزدیک۔ دل کے قریب۔ ایک بار تو اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ کشن کو ڈرائنگ روم میں بٹھا آئی ہے۔ اب اُسے کشن کے لئے چائے وغیرہ کا اہتمام کرنا چاہئے۔ معلوم نہیں وہ چائے بھی لیتے ہیں یا نہیں! کہیں کافی کے شوقین تو نہیں؟ اچانک وہ آئینہ کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اُسے کشن بھی اپنے ہمراہ نظر آیا۔ لیکن جب اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا، تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ اپنے ذہن کی اس کیفیت پر شرمندہ سی ہو کر وہ اپنے وجود میں سما گئی۔

شوبھا نے کپڑے تبدیل کئے۔ سکون سے اپنے لئے چائے بنائی۔ ابھی اس نے چائے سِپ کرنی شروع بھی نہیں کی تھی کہ کال بیل بج اُٹھی۔ اُس نے بیل کی طرف دھیان نہیں دیا۔ ڈور بیل تو رات گئے تک نہ جانے کتنی بار بجتی رہتی ہے۔ کتنے ہی لوگ روزانہ اس کا وقت خراب کرنے آجایا کرتے ہیں۔ ان میں ضرورت مند کم اور بے وجہ ڈسٹرب کرنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔ اُسے اسپتال کے ڈاکٹروں یا محلّہ کے لوگوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کسی کو پسند نہیں کرتی، لیکن گھر آئے افراد کے لئے چائے پانی کا بندوبست تو لازمی طور پر کرنا ہی پڑتا ہے۔ دِل چاہے یا نہ چاہے، اُن سے رسماً بات چیت بھی کرنی ہوتی ہے۔ اتنا ہی نہیں کبھی کبھی غیر ضروری ہاں میں ہاں بھی ملانی پڑتی ہے۔

گھنٹی پھر بجی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کرسی سے اُٹھی اور جا کر دروازہ کھولا۔ سامنے ڈاکٹر پوری، ڈاکٹر انل، یا ڈاکٹر دانش نہیں، بلکہ ڈاکٹر کشن کھڑے تھے۔ اُسے توقع نہیں تھی کہ ڈاکٹر کشن اس کے غریب خانہ پر تشریف لے آئیں گے اور اُسے ان کا استقبال اس طرح کرنا پڑے گا۔

''معاف کرنا شوبھا! میں تمہارے آرام میں مخل ہوا۔'' دروازہ کھلتے ہی ڈاکٹر کشن نے کہنا شروع کر دیا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ اسپتال سے تم جلدی چلی آئیں۔

میں کچھ دنوں کے لئے باہر جا رہا ہوں۔آج جس مریض کا آپریشن ہوا ہے،اُس کی مکمل دیکھ بھال تمہیں کرنی ہے۔دھیان رہے یہ میرا کیس ہے۔ میں اپنے کیس میں پوری دلچسپی لیتا ہوں۔اپنے فرض کے لئے۔اپنے مذہب اور ذمہ داری کے لئے۔ اِس وقت میں یہی کہنے کے لئے تمہارے پاس آیا ہوں۔مجھے یقین ہے،آپ میرے آنے کی لاج رکھتے ہوئے انکار نہیں کریں گی۔''

''جی!یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔'' شوبھا نے مختصر سا جواب دیا۔

''شکریہ!اچھا!!بائی بائی!!!'' اتنا کہہ کر ڈاکٹر کشن واپس جانے لگے۔

''ٹھہرئے!تشریف رکھئے!!چائے تو.........'' شوبھا کی بات اُدھوری رہ گئی۔

''کوئی بات نہیں۔پھر کبھی۔ویسے بھی میں چائے نہیں پیتا۔کبھی کبھی کافی سے ذہنی تسلی کر لیتا ہوں۔تھوڑا جلدی میں ہوں۔'' اسی کے ساتھ ڈاکٹر کشن واپس چلے گئے۔

''میں جس کیس میں دلچسپی لیتا ہوں۔اُسے اپنا فرض سمجھتا ہوں۔مذہب اور ذمہ داری سمجھتا ہوں۔'' بار بار یہ الفاظ اُس کے کان کے پردے پر ہتھوڑے نہیں برسا رہے تھے، بلکہ رَس گھول رہے تھے۔یہ سوال تو حل ہو چکا تھا کہ وہ چائے نہیں پیتے۔وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کتنی پست ہمت ہے۔ڈاکٹر کشن کے سامنے اُس کی زبان پر تالے کیوں پڑ گئے؟اُس نے آج کافی ہی کیوں نہ بنا لی تھی؟چند منٹ کی مزید قربت اس کے ہاتھ سے جاتی رہی۔وہ دیر تک اس کی ہدایت پر غور کرتی رہی۔اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس مریض کی دیکھ بھال میں کسی قسم کا دقیقہ نہیں چھوڑے گی۔اُس نے کیا بھی ایسا ہی۔کچھ روز کے بعد ڈاکٹر کشن بھی آ گئے۔بطور نرس اُس کی تیمارداری میں کوئی فرق نہیں آیا۔مریض کو دیکھ کر کشن بھی بہت خوش تھے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ مریض جلدی صحت یاب ہو گیا،لیکن ڈاکٹر کشن! پہلے جیسے کشن نہیں رہے۔ان کے رویہ میں کافی حد تک تبدیلی آ گئی۔اُس سے جو خلوص اور اپناپن

ملا تھا، اب اس میں پہلے جیسی گرماہٹ نہیں رہی تھی۔ اب کشن اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کرتے تھے۔اس کے برعکس اُن سے کوئی بات کی جاتی،تو اس کا مختصر سا جواب دینے میں کسی قسم کی کوتاہی بھی نہیں کرتے تھے۔

اِس طرح دن، ہفتوں اور مہینوں میں منتقل ہونے لگے۔ان کے رویہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔چہرے پر عجیب سا غرور وتکبر قائم رہا۔

شوبھا کے سپنے شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ کشن نے جو کچھ کہا اور کیا تھا، وہ صرف اپنے فرض کے لئے، اپنے کیس کے لئے، اپنی کامیابی کے لئے، اپنے مریض کے لئے۔مریض اسپتال سے ڈسچارج ہوکر اپنے گھر جا چکا تھا۔اب نہ مریض تھا اور نہ ہی فرض ادا کرنے کا جنون!!

شوبھا کو ڈاکٹر کشن کی کج ادائی پسند نہیں آئی۔رفتہ رفتہ اُس نے بھی کشن کا خیال اپنے دل سے نکال دیا۔اب اگر دِل میں کچھ باقی تھا،تو وہ تھا اس کا فرض۔نرس کی وہی ذمہ داری جو ایک مریض کے لئے ضروری ہوتی ہے۔یہی خیال اُسے اپنے فرض کا احساس دلاتا رہتا۔

حالانکہ اسپتال کے کئی ڈاکٹروں کے نمایاں چہرے بھی اس کے سامنے ہوتے، جو اس کے لئے آسمان سے ستارے تک توڑ لانے کا عہد و پیمان دوہرایا کرتے تھے۔ اسپتال میں اس کے پرستاروں کی کمی نہیں تھی۔ اپنے اور پرائے کا امتیاز اُسے صاف نظر آنے لگا۔وہ کتنی خوش قسمت ہے کہ اسپتال میں ایک بھی فرد اس کا مخالف نہیں۔کئی بار اس کی غلط بات کو بھی ٹھیک اور صحیح تسلیم کرلیا جاتا ہے۔ہر دل میں اس کی قدر ومنزلت موجود تھی۔ہر ایک اس کا دیوانہ تھا۔ہر نفس اُسے چاہتا تھا۔

اس کے بعد کتنے ہی معاملوں میں اُسے ڈاکٹر کشن کے ساتھ کام کرنا پڑا،لیکن شوبھا کے دل میں اب شاید پہلے جیسی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔اب اس کے دِل کے کسی گوشے میں کسی طرح کی ٹیس وکسک نہیں تھی۔کشن کے دیکھنے پر یا اس کے احساس پر بھی اَب اُس کا دل نہیں دھڑکتا تھا۔کبھی کبھی ایسا لگتا، گویا اُسے کشن سے بے گانگی سی

ہو چلی ہے۔ یہ بات اس کے دل میں گھر کر چکی تھی کہ کشن اپنے فرض کے سامنے اُس میں کسی طرح کی دلچسپی نہیں لیتے۔

کشن کے تیئں بغض و کدورت کی آگ میں جھلس کر وہ سب کچھ بھول سی گئی۔ یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھول گئی۔ گردش وقت کو بھول گئی۔ نرس کے فرض کو بھول گئی۔ احساس تک باقی نہ رہا۔ تکبر کی یہ سیڑھی اس کے لئے مضر ثابت ہوئی۔ ایک روز شاپنگ سے لوٹتے ہوئے بازار میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ تیز رفتار کار نے اُسے کچل ڈالا۔ شوبھا کو طبی امداد کے لئے فوراً اسپتال لے جایا گیا، مگر شومئ تقدیر ڈاکٹر اُس کا ایک پیر ضائع ہونے سے نہیں بچا سکے۔ اسپتال میں شوبھا کو پہلے ہی دن جب ہوش آیا تھا، تب اُس نے اپنے پرستاروں کو اپنے چاروں طرف موجود پایا۔ سب اُسے تسلی دے رہے تھے۔ لیکن جب اُنہیں یہ علم ہوا کہ شوبھا کی ایک ٹانگ لازمی طور پر کاٹنی پڑے گی، تب اسپتال کے عملے میں ایک تغیر دیکھا گیا۔ اِس صورت میں اس کے پُرسان حال کی تعداد کم ہونے لگی۔ حالات یہاں تک پہنچ گئے کہ اب اُس کے پاس جو بھی آتا، وہ اپنے فرض سے مجبور ہو کر آتا۔ مریض کی تیمارداری کے لئے آتا۔ نرس شوبھا کے لئے ڈاکٹر پوری، ونود، راکیش.....وغیرہ کی تمام تر ہمدردیاں قریب قریب ختم سی ہو چکی تھیں۔ ان میں غیریت اور اجنبی پن کی حد تک تبدیلی آ چکی تھی۔

جس دن شوبھا کو اسپتال چھوڑ کر گھر جانے کا حکم ملا، اُس کے سلامت بچے پیر کے نیچے سے بھی زمین نکل گئی۔ اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ قلب میں مایوسی گھس گئی۔ اُسے اِس حال میں سہارا دینے والا کوئی نہیں تھا۔ اُس کے پاس صرف اور صرف قدرت کے دئے ہوئے ڈنڈے کا سہارا تھا۔ بیساکھی کے سہارے وہ گھر آ گئی۔ جہاں اپنی آنکھوں سے نکلتے آنسوؤں کے علاوہ اس کا استقبال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ در و دیوار نے مذاق اُڑایا، آئینہ نے منہ چڑایا۔ کچن میں موجود چائے دانی، کپ پلیٹ اور اسٹوو تک روٹھے نظر آئے۔ ماضی کی یاد اور یاس و حرماں کے سمندر میں غوطہ زنی کرتے اُسے گھنٹوں بیت گئے۔

شوبھا اپنے خیالات میں گم تھی، تبھی ایک جانی پہچانی آواز نے نہایت کھوکھلے انداز میں اس کا تسلسل توڑ ڈالا۔ جواب میں سسکیاں اُبھریں۔ بے بسی کے آنسو اُمڑے۔ کال بیل نہیں بجی۔ دروازہ کھلا تھا۔ ڈاکٹر پوری ہمدردی کے طور پر اُس سے ملنے آئے تھے۔ وہی ڈاکٹر پوری، جو گزشتہ ایک سال سے اُسے اپنی ہوس کا شکار بنانے کے نت نئے خواب دیکھا کرتے تھے۔

''شوبھا! تقدیر نے تمہارے ساتھ جو برتاؤ کیا، اس کا واقعی بہت افسوس ہے۔ اب تمہیں اس واقعہ کو بھولنا ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ اس حادثے کے بعد اب تم نرس کے کام کو انجام نہیں دے سکوگی، لیکن پھر بھی اپنے آپ کو بے سہارا مت سمجھنا۔ خود پر بھروسہ رکھو۔ اُوپر والا سب ٹھیک کر دے گا۔ اگر میں تمہارے کسی کام آ سکا، تو خود کو خوش قسمت سمجھوں گا۔ فی الحال یہ دو سو روپے رکھ لو، کام آئیں گے۔.......''

ڈاکٹر پوری کتنی دیر اپنا لیکچر جاری رکھتے، پتہ نہیں۔ اس درمیان شوبھا کی درد بھری چیخ فضا میں گونج گئی۔

''ڈاکٹر صاحب! اپنی ہمدردی اور کاغذ کے ان انمول ٹکڑوں کو اپنے پاس سنبھال کر رکھئے۔ وقت پر کام آئیں گے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے۔ مہربانی فرما کر یہاں سے چلے جایئے۔ ممکن ہو تو زندگی بھر اِدھر کا رُخ مت کیجئے۔''

ڈاکٹر پوری چلا گئے۔ اُسے اپنی قسمت پر رونا آ گیا۔ اُس کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ اُسے آنسوؤں کا ختم نہ ہونے والا خزانہ مل گیا تھا۔ گزشتہ زندگی کی کتاب کے اوراق اس کے سامنے ایک ایک کر کھلتے جا رہے تھے۔ اِسی درمیان گھنٹی پھر چلاّ اُٹھی۔!!

''چلے جایئے ڈاکٹر! چلے جایئے!! مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔ کسی کی ہمدردی نہیں چاہئے مجھے۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔ میرے حال پر ترس ......'' شوبھا کی سسکیاں کمرے کی فضا کو مکدر بنا رہی تھیں۔

اچانک دروازہ کھلا اور ایک پر درد آواز پردۂ سماعت سے ٹکرانے لگی۔ سامنے

کشن کھڑا تھا۔ڈاکٹر کشن!!

''معاف کرنا شوبھا!تمہاری سسکیوں نے مجھے مجبور کردیا،ورنہ اجازت کے بغیر کبھی اندر نہیں آتا۔یہ ٹھیک ہے کہ تمہیں کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں،لیکن ایسا صرف تم کہتی اور سوچتی ہو۔جہاں تک میں سمجھتا ہوں تمہیں ایک عدد ہمدرد کی ضرورت ہے۔بیساکھی کی نہیں،بلکہ ساتھی کی ضرورت ہے۔ایسے ساتھی کی جو تمہارا دُکھ درد بانٹ سکے۔جو کسی بھی پل تمہیں احساس کمتری کا شکار نہ ہونے دے۔جو تمہیں کبھی یہ خیال تک آنے نہ دے کہ ایک حادثہ کے بعد تم سے تمہاری ایک ٹانگ سدا کے لئے چھین لی گئی ہے۔''

''آ جایئے ڈاکٹر صاحب! میں سمجھی تھی کہ .....''اس کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ کشن نے پھر کہنا شروع کردیا۔

''شوبھا!تمہیں یقین نہیں آئے گا،میں تم سے دِل سے محبت کرتا ہوں۔میں نے ہمیشہ تمہیں اپنے قلب میں جگہ دی ہے۔یہ تو ہوسکتا ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت نہ ہو،لیکن میں نے تمہیں دل و جان سے چاہا ہے۔میرے دل میں تمہارا مقام مندر میں نسب کسی مورتی کی طرح ہے۔اسے میری بدقسمتی کہا جاسکتا ہے کہ میں نے اپنی محبت کا تم سے کبھی اظہار نہیں کیا۔کُھل کر کہنے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی۔شوبھا! میں تمہارے لئے ہمدردیوں کی سوغات نہیں لایا۔میں تمہارا سہارا بن کر تمہیں تمہاری نظروں میں گرانا نہیں چاہتا۔میں تمہاری بیساکھی بننا چاہتا ہوں۔تم سے کبھی الگ نہ ہونے والی۔''ڈاکٹر کشن خاموش ہوئے ہی تھے کہ شوبھا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''نہیں! ڈاکٹر صاحب، یہ ممکن نہیں ہے۔میں تمہارے قابل نہیں رہی۔ میں آپ پر بوجھ نہیں بن سکتی۔'' شوبھا نے اپنے ہاتھوں سے چہرہ چھپالیااور مزید رونے لگی۔

''شوبھا میں جانتا ہوں کہ کئی بدنگاہیں تمہارا تعاقب کیا کرتی تھیں۔تمہیں حاصل کرنے کے خواب دیکھنے والے کئی لوگ تھے،لیکن اب مجھ سے تمہیں کوئی چھین

نہیں سکتا۔ تم میرے ساتھ رہوگی۔ میری زندگی کا اٹوٹ حصہ بن کر!'' اتنا کہہ کر ڈاکٹر کشن شوبھا کے قریب آ کھڑا ہوا۔

وہیل چیئر پر بیٹھی شوبھا، کشن کا شکریہ ادا کرنے کے لئے اپنی بیساکھی کے سہارے اٹھنا ہی چاہتی تھی، تبھی کشن نے آگے بڑھ کر اُسے اپنی باہوں میں تھام لیا۔ شوبھا کی آنکھوں سے نکلے آنسوؤں کا سیلاب کشن کے سپاٹ سینہ میں جذب ہو گیا۔

OO

(اگست ۱۹۷۴ء)

طوفاں طوفاں، ساحل ساحل

شبینہ!

جی ڈاکٹر صاحب!!

تم سے کئی بار معلوم کر چکا ہوں، لیکن تم نے ابھی تک اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

کیا بتاؤں، ڈاکٹر صاحب؟

کچھ تو بتاؤ! اپنے بارے میں۔ گھر اور خاندان کے بارے میں۔

اپنے بارے میں کچھ نہ کہہ سکوں گی۔ آپ تو خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ گئیں۔ بہتر ہو آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ مجھے اس طرح سے پریشان نہ کریں۔

شبینہ! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم غم کی ماری ہو۔ تمہاری گہری آنکھیں اپنے سینے میں غموں کا بوجھ چھپائے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ دکھ بانٹنے اور حالات زندگی سنانے سے درد کم ہو جاتا ہے۔ قلب کو سکون ملتا ہے۔ میں تمہاری ہمدرد ہوں۔ کیا ایک عورت دوسری عورت کو اپنا درد اور اپنی پریشانی نہیں سنا سکتی؟ میں تو ویسے بھی تمہاری ڈاکٹر ہونے کے ساتھ تم سے کافی قریب ہوگئی ہوں۔ میرے دل میں تمہارے لئے کتنی جگہ ہے، میں ہی جانتی ہوں۔ کیا ایک چارہ گر کے ناطے تمہارے دکھ درد میں شریک ہونے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے؟

یہ سب تو ٹھیک ہے، مگر......

میرے المناک احساس و خیالات کی دُنیا اتنی وسیع ہے کہ سوچتے سوچتے میرا دماغ ماؤف ہونے لگتا ہے۔ وہ شام، وہ وقت، وہ عالم شہنائی، میرے دل و دماغ پر ابھی تک جوں کا توں موجود ہے۔ وہ خوبصورت شام، بے شمار ستاروں جیسے بلب، ٹیوب لائٹس، بہاروں کی طرح جگمگاتا ماحول، دُلھن کی مانند سجے ہوئے کمرے، تمام گھر میں خوب چہل پہل تھی۔ چہل پہل کا اصل مرکز میں ہی تھی۔ سہیلیوں نے مارے خوشی کے طوفان کھڑا کر رکھا تھا۔ سب کے چہرے مسرت و شادمانی سے خنداں تھے۔ ہر ایک بحرِ مسرت میں غوطے لگا رہا تھا۔ محفل اپنے جوبن پر تھی۔ خوشی و شادمانی کے دَور میں میرے گھر سے وداع ہونے کا وہ وقت بھی آ گیا، جب اپنے اُس عزیز گھر، جس کی دھول و مٹی میں کھیل کود کر میں اتنی بڑی ہوئی تھی، کو خیر باد کہہ کر سسرال جانا پڑا۔

سسرال میں مجھے کسی طرح کی کوئی کمی نہ تھی۔ عیش و عشرت دامن پھیلائے ہر طرح کی خوشی اور آرام لئے میرے سامنے حاضر تھا۔ گھر میں سیم و زر کے انبار کے علاوہ پیار نچھاور کرنے والی ساس و نند بھی تھیں۔ مگر ان سب کے باوجود مجھے یہ نیا گلشن ویران سا لگتا تھا۔ میرے وجود پر اُداسی نے ڈیرہ جما لیا تھا۔ میرے ہمراہ ایک دکھ تھا، ایک درد تھا، ایک غم تھا۔ میرے دل کو اگر کوئی شے کریدتی تھی، تو وہ ایک آرزو تھی، ایک تمنا تھی، ایک ٹیس، ایک کسک......

میرے شوہر ٹی بی کے مریض ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد مرض کے ساتھ پریشانیوں کا آغاز بھی ہو گیا۔ میں یہ بالکل بھول گئی تھی کہ جب کسی شخص کے اُوپر غم کا پہاڑ ٹوٹتا ہے، تو دیگر مصیبتیں بھی چاروں سمت سے یکجا ہو کر آ جاتی ہیں۔

صبح کا سہانا وقت تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی نسیم نے موسم کو خوشگوار بنا رکھا تھا۔ آسمان پر ابھی بھی کہیں کہیں تارے نظر آ رہے تھے۔ اُفق کی روشنی سے رات ک تیرگی دُور بھاگ رہی تھی۔ ماں نے فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد بیٹے کے لئے دُعائے صحت مانگی۔ نماز و دُعا سے فارغ ہو کر وہ ابھی مصلّے سے اُٹھنے بھی نہ پائی تھیں کہ اُن کو دَورہ پڑ

گیا۔ دِل کے دورے کا یہ پہلا معاملہ نہ تھا۔اس سے قبل بھی دوبار ایسا ہو چکا تھا۔ماں کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل میرے بس میں نہ رہا۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔میں خوف وہراس کے سبب کانپ رہی تھی۔ میں نے جیسے تیسے کر کے اُنہیں پلنگ پر لٹایا۔تبھی ان کے جسم میں زور کی حرکت ہوئی اور پھر بدن بے حرکت ہو گیا۔وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ ہمیشہ کے لئے۔اب ہمارے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہ تھا۔

ربِ کعبہ کی بارگاہ میں بڑی بڑی دُعائیں مستجاب ہو جاتی ہیں،مگر میری ایک چھوٹی سی دُعا قبولیت کی منزل کونہیں پہنچ سکی۔قدرت کو نہ جانے کیا منظور تھا۔ انور اسپتال میں زیرِ علاج تھے۔ان کے لئے دوا لادوا ہوگئی تھی۔ماں کی موت کا غم ان کو برابر کھائے جا رہا تھا۔بدقسمتی ابھی بھی ہمارا پیچھا کر رہی تھی۔ ہماری پریشانیوں کا آخر نہ ہونا تھا، نہ ہوا۔ایک روز میں اور ذکیہ اُنہیں کے پاس تھے۔ایسا محسوس ہوا جیسے ہماری دُعامیں اثر آگیا ہو۔ ہماری آرزو پوری ہونے کو ہے۔اُن کا چہرہ پوری طرح کھلا ہوا تھا۔ مرجھائے چہرے پر اَب تازگی آگئی تھی۔ہونٹوں پر مسکراہٹ اورآنکھوں میں چمک تھی۔ یہ چمک عجیب سی تھی۔ میری نگاہیں ان کے چہرے پر مرکوز تھیں،تبھی اُنہیں کھانسی اُٹھنی شروع ہوگئی۔کھانسی رکنے کی بجائے رفتہ رفتہ زور پکڑتی جا رہی تھی۔دِل کا پنکھا زور سے ہل رہا تھا۔پھیپھڑے میں درد ہونے لگا اور اسی کے ساتھ ان کے منہ سے جما ہوا ساخون نکلا۔خون کی اُلٹیاں دیکھ کر ہم گھبرا گئے۔ہم سے ان ک یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔زندگی کا چراغ کسی بھی وقت بجھ سکتا تھا۔ حقیقت سے واقفیت کے باوجود ہم اُنہیں جھوٹی تسلّیاں دیئے جا رہے تھے۔تبھی میرے منہ سے نکلا، ڈاکٹر.....!

ان کے چہرے پر کسی قدر ٹھہراؤ تھا۔ایسا لگتا تھا،جیسے وہ کہہ رہے ہوں،"تم دونوں کیوں رو رہی ہو؟ بھلا سِل پٹ کی اس مہلک بیماری نے کسی کو معاف کیا ہے؟" اتنے میں ڈاکٹر آگئے۔اُنہوں نے ہمیں سمجھاتے ہوئے کہا،"آپ لوگ دھیرج رکھئے۔سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اور سچ مچ وہ ٹھیک ہو گئے۔اب اُنہیں نہ کھانسی آ رہی تھی اور نہ منھ سے خون نکل رہا تھا۔وہ سو رہے تھے! سکون کی نیند!! سبھی دُکھوں سے چھٹکارا پا کر ہمیشہ کی نیند!!!

ابھی خوشدامن کو گزرے ہوئے دو مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ سر کے تاج نے بھی داغِ مفارقت دے دیا۔رنج وغم اور صدمات کی دِل پر ایسی چھاپ ثبت ہوئی کہ کسی پل غم سے رہائی ممکن نہ تھی۔میں تیرگی کے غار میں بھٹک رہی تھی۔تنہائی کا کالا ناگ پھن پھیلائے میری جانب بڑھ رہا تھا۔ذکیہ کا تو برا حال تھا۔ماں اور بھائی کے چلے جانے کا غم اُس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔وہ ویرانے میں تنہا بیٹھی تھی۔ایک ہرا بھرا گلشن آن کی آن میں اُجڑ گیا تھا۔امیدوں کا محل مسمار ہو چکا تھا۔والدہ کے سائے کے بعد بھائی کا پیار بھی چھن گیا۔ہم ایسے دوراہے پر کھڑے تھے،جہاں سے منزل بچھڑ جاتی ہے۔ہمارا درد و کرب سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔میں اب دُنیا سے بے نیاز سی ہو گئی تھی۔جینے کی تمنا باقی نہیں رہی تھی۔

دوسرے دن سورج ڈھلے ذکیہ کے شوہر زاہد صاحب آ گئے۔اُنہیں دیکھتے ہی ہماری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ پڑا۔اُنہوں نے ساس اور برادرِ نسبتی کے انتقال پر اپنے غم کا اظہار کیا اور ہمیں تسلّی دی۔اسی طرح کئی دِن گزر گئے۔

اَب زاہد صاحب انور کے کام کاج کی دیکھ بھال کرنے لگے اور قطعی طور پر وہیں رہنے لگے۔وہ اکثر گھر میں آتے جاتے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ان کا اس طرح گھورنا مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔اب مجھے اُن سے خوف لگنے لگا تھا۔ہاں البتہ ذکیہ کی ہمدردی میں کسی طرح کے فریب کی بُو نہیں تھی۔وہ اکثر میرے اور میری تنہائی کے بارے میں سوچ کر اداس ہو جایا کرتی تھی۔آخرکار ایک دن موقعہ دیکھ کر اُس نے مجھ سے اپنے دِل کی بات کہہ ہی دی۔

''بھابی!''

''ہوں۔''

”اگر آپ برا محسوس نہ کریں تو ایک بات کہوں۔“

”ہاں ہاں! ضرور کہو۔اس میں اجازت لینے یا برا ماننے کی کیا بات ہے؟ ضرور کہو، کیا کہنا ہے؟“

”بھابی! جس کے نصیب میں جتنے جھٹکے لکھے ہوتے ہیں، وہ اُسے ضرور لگ کر رہتے ہیں۔ جو ہماری قسمت میں تھا، وہ ہو گیا۔ تقدیر پر کبھی کسی کا بس نہیں چلا ہے اور نہ کبھی چلے گا۔ زندگی سے مایوس ہونا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ کفر ہے۔ آپ کی یہ حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ آپ کے درد کی آواز میرے کانوں میں تیر کی طرح چبھتی ہے۔ آپ نے اپنا خیال رکھنا بھی ترک کر دیا ہے۔ یہ زلفیں جو سنورنے کے قابل ہیں، بے ربط نہیں دیکھی جاتیں۔ اِن لبوں پر تبسم کا زمانہ تھا اور ان رخساروں پر........۔“

اُبھی ذکیہ کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ میں نے ٹوک دیا، ”آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو، ذکیہ؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔“

”بھابی! آپ کے سینہ میں جو زخم ہو گئے ہیں، اگر آپ چاہو، تو وہ مندمل ہو سکتے ہیں۔ ابھی یہ زخم اس قابل نہیں ہوئے ہیں کہ ان کا مداوا نہ ہو سکے۔ یا پھر زندگی کی آس ہی چھوڑ دی جائے۔ بھابی آپ مخمور سے نکاح کر لو!!!“ ذکیہ نے لا دھڑک کہہ دیا۔

”ذکیہ!!“ میرا چہرہ تمتما اُٹھا۔ ایسا لگا، جیسے کسی نے زہر کا بجھا نشتر میرے جگر میں اُتا دیا ہو۔ مجھے قطعی طور پر یہ امید نہیں تھی کہ ذکیہ بھی میرے درد بھرے زخموں کو کرید دے گی۔ میں نے ہی اُسے اپنا راز بتا کر غلطی کی تھی، ورنہ وہ ایسا کہنے کی جرأت نہیں کرتی۔ مخمور جو اسکول میں میرے ساتھ پڑھتا تھا۔ مجھے اس میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، لیکن وہ مجھ سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اس کے دل میں اگر کسی دوشیزہ کی تصویر تھی، تو وہ میں تھی۔ یہ راز بھی اُس روز کھلا، جس دن گرمیوں کی تعطیل میں سب طلباء اپنے اپنے گھر جا رہے تھے۔

”شبینہ! تم جا رہی ہو؟“ پیچھے سے آئی ایک تھرتھراتی آواز نے مجھے چونکا

دیا۔ پلٹ کر دیکھا تو، وہ مخمورؔ تھا۔

میرے منھ سے نکلا۔ "ہاں، میں جا رہی ہوں۔"

"تو اب ہم ایک دوسرے سے کبھی نہ مل سکیں گے۔ کالج کا گراؤنڈ اور یہ پتھریلی سڑک ہماری چہل قدمی کو ترسیں گے۔ اب ان راہوں سے ہمارا گزرنا ممکن نہیں ہوگا۔ کیاریوں میں لگے پودے اپنے پھولوں میں تمہارے بدن کی خوشبو کو ترسیں گے۔ ان کی شگفتگی ...."

اس کی بات بیچ میں کاٹ کر میں نے کہا، "میں کچھ سمجھی نہیں! مخمورؔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ پہیلیاں مت بجھاؤ۔ صاف صاف کہو۔ آخر بات کیا ہے؟"

"کچھ نہیں سمجھیں۔"

"ہاں! میں کچھ نہیں سمجھیں!!"

"کتنی معصوم؟ کتنی بھولی؟ اور کتنی نادان ہو تم شبینہؔ؟ اتنا کچھ کہہ دینے کے بعد بھی تم کچھ نہیں سمجھیں۔ شبینہؔ تم نہیں جانتیں!! میں تم سے پیار کرتا ہوں، سچا پیار......."

اتنا سنتے ہی میں ٹپٹا کر رہ گئی۔ پیار و نفرت کے ملے جلے تاثرات اجاگر ہونے لگے۔ میں شش و پنج میں تھی کہ بس کی پوں پوں نے میرے تخیلات کا تسلسل توڑ دیا۔ میں قدم اُٹھاتے ہوئے بس کی جانب بڑھ گئی۔ وہ بھی لاری تک میرے پیچھے آیا۔ بس فوراً چل پڑی۔ چلتی بس میں ایک لفافہ میری سیٹ پر آ کر گرا۔

اپنی گود میں لفافہ دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ مجھے مخمور میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چند لمحات کے تردد کے بعد آخر کار میں نے لفافہ اُٹھالیا۔ پلٹ کر دیکھا، اس پر میرا نام درج تھا۔ میں نے لفافہ چاک کیا۔ اندر کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا۔ پرچہ پر لکھا تھا، "شبینہؔ! زندگی کے کسی موڑ پر اگر میری یاد آئے، تو اِس پتہ پر خط لکھ دینا۔ انتظار کروں گا۔ تمہاری یادیں سدا میرے پاس میرے سینہ میں محفوظ رہیں گی۔

خط پڑھنے کے بعد تمام راستے میں مخمورؔ کے بارے میں سوچتی رہی۔ اب مجھے اس میں کسی قدر دلچسپی سی ہونے لگی۔ لمبا قد، گول گندمی چہرہ، گھنگرالے بال، بھولی اور

معصوم سی آنکھیں، ایک حسرت لئے میرے سامنے تھیں۔ کتنا بلند ہے اس کا پیار؟ کتنا ضبط کیا اُس نے؟ جانے کب سے وہ میری چاہت میں گھل رہا ہے؟ کالج میں کبھی اس نے اپنی محبت کا اظہار تک نہیں کیا، لیکن اب جب بات برداشت سے باہر ہوگئی، تو دِل کی بات زبان پر آگئی۔

ڈاکٹر! کچھ دنوں بعد میں نے مخمور کو خط لکھا۔ میں اُسے دھوکا دینا نہیں چاہتی تھی۔ میں اس کے لئے ایسے تھی، جیسے گولر کا پھول! میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی خستہ حال نوجوان کو دھوکے میں رکھا جائے۔ میں نے اُنہیں لکھ دیا، ”جواب کے انتظار میں مخمور تم نہ جانے کیا سوچ رہے ہوں گے۔ تمہارے ذہن میں طرح طرح کے خیالات جنم لے رہے ہوں گے۔ لیکن تمہیں نہیں معلوم کہ میں گھر آکر کس مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔ گھر آئی تو معلوم ہوا کہ والد صاحب نے میرا رشتہ کسی دوسری جگہ طے کردیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی میرے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ چہرے کی تازگی کم ہوگئی۔ میرے آگے اندھیرا چھا گیا۔ میرے دل کے پردے پر تمہاری الفت کے نقوش اُبھر آئے۔ لیکن میں کیا کروں؟ کچھ کہنے یا کرنے سے مجبور ہوگئی۔ گھر میں کسی سے کچھ کہنے کی ہمّت نہیں تھی۔

ایک روز امی جان کے یہ پوچھنے پر کہ بیٹی تو اداس اور کھوئی کھوئی سی کیوں رہتی ہے؟ میں نے تمام حالات ان کے سامنے کھول کر رکھ دیے، مگر حاصل کچھ نہ ہوسکا۔ میں نے زیادہ ضد کی، تو اُنہیں خاموش ہو جانا پڑا۔ لیکن یہ میرا وہم نکلا۔ اُنہوں نے اپنا آخری ہتھیار استعمال کر ڈالا۔ میری سرکشی پر والد صاحب نے اپنی عزت و وقار اور ماں نے اپنے دودھ اور درد کا واسطہ دیا۔ امید کی جھولی میرے آگے پھیلا دی۔ ان کی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسوؤں نے مجھے مجبور کر دیا۔ میں معاشرے اور اِس ظالم سماج سے گھبرا گئی۔ خاندان کی عزت کی خاطر میں نے تمہاری محبت کو قربان کر دیا۔ اِس کے علاوہ ایک مجبور و بیکس لڑکی آخر کر بھی کیا سکتی تھی۔

ڈاکٹر!!

مخمور! جس کی پاک محبت کی میں قدر نہ کر سکی۔ جس کے پیار کو میں نے ماں باپ کی انا پر قربان کر دیا۔ ذکیہ نے اُسی مخمور کا ذکر میرے سامنے کر دیا۔ میرے زخم ہرے ہو گئے۔ میری ناراضگی پر وہ اُداس ہو گئی۔ اُس کی آنکھوں میں موتی جھلکنے لگے۔ میں نے وفورِ محبت سے اُسے گلے لگا لیا۔ وہ بھی مجھ سے چپٹ گئی۔ ذکیہ کی ہمدردی اور خلوص میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ لیکن ڈاکٹر!! وقت نے پھر کروٹ بدلی۔ ایک دِن ذکیہ پڑوسن کے یہاں کسی کام سے گئی تھی۔ میں گھر میں تنہا تھی۔ اپنے آپ کو پوری حویلی میں اکیلا محسوس کر رہی تھی۔ لیکن یہ میری بھول تھی۔

میری بدقسمتی قدم قدم پر میرے ساتھ تھی۔ اِس کا علم مجھے تب ہوا، جب کھٹاک کی آواز آئی اور دروازہ اندر سے بند ہوا۔ زاہد میاں سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں فریب، عیاری اور حیوانیت صاف جھلک رہی تھی۔ میں سہم گئی۔ میری زبان میرا ساتھ چھوڑ گئی۔ وہ کسی خوفناک درندے کی طرح میری جانب بڑھ رہے تھے۔ میں رونے لگی۔ الفاظ میرا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ وہ ایک چیتے کی طرح مجھ پر جھپٹنے ہی تھے کہ تبھی اَللہ رب العزت کو مجھ پر رحم آ گیا۔ دروازہ بھی اندر سے لاک نہیں کیا گیا تھا۔ تبھی ذکیہ اندر آ گئی۔ وہ زور زور سے چلاّتے ہوئے اپنے شوہر کو بُرا بھلا کہنے لگی۔ میں ذکیہ سے لپٹ کر رونے لگی۔ زاہد کمرے سے باہر چلے گئے۔ وہ شوہر کی ناپاک حرکت پر بہت شرمندہ تھی۔

اب یہ گھر میرے قابل نہیں رہ گیا تھا۔ اب اس مندر میں عصمت کے چڑھاوے کی درکار تھی۔ گلشن کا باغبان، گلچیں بن چکا تھا۔ حویلی میرے لئے جہنم بن گئی تھی۔ میرے سینے میں طرح طرح کے خیالات پھڑک رہے تھے۔ تبھی ہوا کا تیز جھونکا کمرے میں آیا اور دیوار پر لگے پوسٹروں کو ہلا گیا۔ گلا ابھی بھی روندھا ہوا تھا۔ مجھے گھر تپتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اب وہاں ٹھہرنا میرے بس سے باہر تھا۔ میں آگے بڑھ گئی۔ اچانک میرے قدم رُک گئے۔ میری ہمت جواب دے گئی۔ ایسا لگا، جیسے میرے لئے اِس گھر کے علاوہ کہیں اور جگہ نہیں ہے۔

اس کے باوجود میں ہمت کر کے حویلی سے نکل کر باہر سڑک پر آ گئی۔ زندگی سے عاجز، اپنے آپ سے فرار اور کھوئی کھوئی دیوانہ وار۔ مجھے کسی طرح کا ہوش نہ تھا۔ مجھے تو اس آتش کدہ سے نکلنے کی جلدی تھی، جو میرے وجود کو جلا رہا تھا۔ میں عالم ہیجان میں بھاگ رہی تھی۔ مجھے اپنے چاروں طرف مہیب سناٹا سا محسوس ہوا۔ میں انجان راستے پر بڑھے جا رہی تھی۔ اچانک مجھے اپنا بدن کسی پہاڑ کے نیچے دبتا محسوس ہوا۔ میری کہانی سن کر ڈاکٹر صاحبہ رونے لگیں۔

''ڈاکٹر!! آپ کیوں رونے لگیں؟ آپ کو کیا ہوا۔ اسی لئے میں اپنے بارے میں کسی کو بتانا نہیں چاہتی تھی۔ میری کہانی نے آپ کو بھی رُلا دیا!!!'' شبینہ خاموش ہو گئی۔

''ذکیہ! جسے تم پہاڑ کہہ رہی ہو، وہ پہاڑ نہیں تھا!! بلکہ میری کار تھی۔'' ڈاکٹر اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ ایک نرس ان کے پاس آ کر رُکی۔ اُس کا سانس اُوپر نیچے ہو رہا تھا۔

''ڈاکٹر!! دی پیشنٹ آف بیڈ نمبر فور از ویری سیریس۔ پرہپس ہی اِز اِن لاسٹ اسٹیج......!!''

''کون؟ مخ....مو......ر!!''

'یس ڈاکٹر، ہی از مخمور!''

ڈاکٹر تیز قدموں سے بیڈ نمبر فور کی جانب بڑھ گئیں۔ مخمور نام سن کر شبینہ چونک گئی۔ اُسے خیال آیا کہ کہیں یہ وہی مخمور تو نہیں؟ اُس کا مخمور! غیر شعوری طور پر وہ اپنے بیڈ سے نیچے اُتری اور ڈاکٹر رُوبی کے پیچھے پیچھے چل دی۔

کیا بات ہے مخمور؟

''میں نے بلایا ہے ڈاکٹر! تمہیں میں نے بلایا ہے!! تمہارے مریض نے۔ میری ہمراز! اَب میرا آخری وقت آ پہنچا ہے!! میں نے تمہیں بہت دُکھ دئے ہیں۔ اَرے اِدھر اُدھر کیا دیکھنے لگیں۔ سنا نہیں میں کیا کہہ رہا ہوں؟ مجھے معاف کر دینا۔ اور ہاں! اگر کبھی اتفاق سے شبینہ مل جائے، تو اُسے میرے بارے میں کچھ مت بتانا۔ وہ برداشت نہیں کر...... پا...... ئے...... گی۔ اِسی کے ساتھ اُس کا سر ایک طرف کو لڑھک

گیا۔

شبینہ بیڈ کے پاس پہنچ چکی تھی۔ ڈرامہ ختم ہو چکا تھا، لیکن مریض کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ مخمور ہے۔ وہی مخمور، جس نے اُسے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ ایسا لگا کہ مرنے کے بعد بھی اُس کی کھلی آنکھوں کو اُس کا انتظار ہے۔ شبینہ ایک ٹک اُسے دیکھے جا رہی تھی۔ اچانک ایک چیخ فضاء میں گونجی اور بیڈ نمبر فور پر گرا دوسرا جسم بھی ٹھنڈا ہو گیا۔

OO

(مارچ ۱۹۷۳ء)

کاغذ کا پھول

''یہ ہیں مہتاب میرے بھائی! میرے دوست!! بس یہ سمجھو کہ ہم دونوں کسی شاخ پر لگے دو پتوں کی طرح ہیں۔ اور یہ ہیں تمہاری بھابی شہناز!'' وہاب نے دونوں کا تعارف کرایا۔

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' مہتاب نے کہنے کو تو کہہ دیا، لیکن شہناز کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی وہ اک دم حیران رہ گیا۔ اُس نے کسی طرح خود کو سنبھالا اور رسماً مختصر سا دوسرا جملہ پورا کرتے ہوئے کہا، ''بیٹھیے! تشریف رکھیے!!''

شہناز، مہتاب سے نگاہیں نہیں ملا پائی اور فرش کی جانب دیکھنے لگی۔ اُدھر مہتاب، شہناز کو اس رُوپ میں دیکھ کر ماضی کے دھندلکوں میں کھو گیا۔ اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے وہ حقیقت ہے یا سراب۔

وہاب بھائی اور ان کی دُلہن کو دیکھ کر ناہید بہت خوش ہوئی۔ وہ جلدی سے کچن میں گھس گئی۔ مہتاب بھی پیچھے سے کچن میں گیا اور اپنے ہاتھ سے کافی بنانے لگا۔ کچھ دیر بعد ناہید نے ناشتہ کی ٹرے میز پر لا رکھی اور اُنہیں کافی پیش کی۔

''کیا مزے دار کافی بنائی ہے! بالکل شہناز جیسی! وہی ٹیسٹ! وہی ذائقہ!! ذرا سا بھی تو امتیاز نہیں!!'' کافی سِپ کرتے ہوئے وہاب نے تعریفی جملے کہے۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل مجھے کافی پسند ہے۔'' اسی کے ساتھ زوردار قہقہے فضا میں گونج گئے۔ مہتاب کی نگاہیں شہناز پر مرکوز ہو چکی تھیں۔ گلاب کی

پنکھڑیوں کی طرح ہلتے ہوئے ہونٹ، چمکتے ہوئے موتیوں جیسے خوبصورت دانت، چھوٹی ناک پر بھنورے کی طرح نمایاں کالی لونگ اور سیاہ لمبی زلفیں، جو شانوں پر تھرکتی ہوئیں گورے بدن پر چار چاند لگا رہی تھیں۔

تسلسل توڑتے ہوئے وہاب نے سوال کیا، ''مہتاب! تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟''

''وہاب بھائی! میں آپ کی طرح چپکے سے شادی کرنے والا نہیں ہوں۔ جب کبھی وہ وقت آئے گا تو اس میں دوستوں کو ضرور شریک کیا جائے گا۔ فی الحال تو شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''ہے کوئی لڑکی؟ پیار کرتے ہو کسی سے؟ یا بس یوں ہی......!'' وہاب نے چٹکی لیتے ہوئے الفاظ کھینچے۔ ''ارے تم خاموش کیوں ہو گئے؟ چہرے پر اُداسی کیوں چھا گئی؟ اس میں چھپانے والی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے، تو بتاؤ، ورنہ ہم کوئی اچھی سی لڑکی تلاش کرکے تمہارا رشتہ طے کئے دیتے ہیں۔ خدا کو منظور ہوا تو چٹ منگنی، پٹ بیاہ بھی ہو سکتا ہے۔''

''واہ بھائی جان! آپ نے شادی کی، تو وہ بھی چوری سے اور پھر کورٹ میں جاکر۔ کیا میرے لئے بھی کوئی ایسی ہی......؟''

''نہیں بھائی نہیں! تمہیں غلط فہمی ہے۔ دراصل، وہی شادی پوری طرح کامیاب و کامران ہوتی ہے جس میں میاں اور بیوی دونوں خوشحال زندگی بسر کرسکیں۔ اِس دَور میں لَو میرج سے بڑھ کر میں تو کچھ سمجھتا نہیں۔ نہ جہیز کا جھنجھٹ اور نہ مہمانوں کی ضیافت کی فکر۔ رجسٹرار کے سامنے حاضر ہو جاؤ۔ گواہ کے سامنے شادی رجسٹر پر دستخط کرو اور بس......۔''

وہاب نے بیچ میں ہی بات کاٹتے ہوئے کہا، ''جی ہاں! یقین تو میرا بھی قریب قریب یہی ہے۔ مگر اہلِ مشرق ہونے کے ناطے معاشرے میں چلے آرہے اسلامی طریقہ پر نکاح اور گھر والوں کی مرضی کو بھی تو ملحوظ خاطر رکھنا پڑتا ہے۔

اُنہیں تو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پھر مجھے شادی کی جلدی بھی کیا ہے؟ جنہیں جلدی ہوتی ہے، وہ چپ چاپ شادی کر لیتے ہیں۔ گھر میں ناہید ہے۔ وہ جیسے تیسے کھانا بنا ہی لیتی ہے۔"

"نہیں بھیا! میرے کھانا بنا لینے بھر سے کیا ہوتا ہے؟ گھر میں بھابی تو آنی ہی چاہئے۔ بھابی کے بغیر تو یہ گھر سونا سونا لگتا ہے۔ مجھے بھابی چاہئے اور وہ بھی شہناز بھابی جیسی۔" ناہید نے بیچ میں ہی لقمہ دیا۔

"دیکھا مہتاب! ناہید کی بھی وہی رائے ہے، جو اپنی ہے۔"

"یہ تو پگلی ہے۔ اسے کیا معلوم کہ آپ اور ہم کتنے برس ایک ساتھ رہے ہیں؟ تب تو یہ بہت چھوٹی تھی۔ آج پھر پورے چار برس کے بعد اِس گھر میں چہل پہل ہوئی ہے۔ آپ سامنے والے اُسی کمرے میں رہیں گے، جس میں کبھی تنہا رہا کرتے تھے۔ آج بھی آپ کا کمرہ اُسی طرح سے محفوظ و مختص ہے، جس طرح آپ چھوڑ گئے تھے۔ کمرے کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا گیا ہے۔ آپ دونوں یہیں رہیں گے۔ ٹھیک ہے نہ!! رہی بات میری شادی کی، تو پہلے مجھے ناہید کو وداع کرنا ہے۔ اپنے بارے میں بعد میں سوچوں گا۔"

دِن برابر گزرتے جا رہے تھے۔ گھر میں رونق ہونے کے باوجود مہتاب اور زیادہ بجھا بجھا سا رہنے لگا۔ اُس کی آنکھوں کے اردگرد سیاہ حلقے سے پڑ گئے۔ کمزوری دن بہ دن اُس کا ساتھ دیے جا رہی تھی۔ اُسے سخت قسم کا صدمہ تھا، جو اُسے گھن کی طرح اندر ہی اندر کھوکھلا کئے جا رہا تھا۔ لاکھ پوچھنے پر بھی اُس نے اپنا راز کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ وہاب قریب قریب روزانہ مہتاب سے اس ضمن میں گفتگو کر اس کے دل میں پوشیدہ راز اُگلوانے کی سعی کرتا تھا، لیکن بے فیض۔ اسے تو اب اُس وقت کی تلاش تھی، جب موت اس کے جگر میں ہو چکے زخموں پر اپنا مرہم رکھ دے۔ اُن زخموں پر جو کسی بے وفا کی وجہ سے اُس کے دل میں پیدا ہو گئے ہیں۔

ماں کی موت کے بعد جب وہ دہلی لوٹا تو اس کے تعجب کی حدو انتہا نہ رہی

تھی۔ وہ گھر جس میں شہناز اپنے ڈیڈی کے ساتھ رہا کرتی تھی، بند تھا۔ دروازے پر موٹا سا تالا پڑا تھا۔ محلے کی عمر رسیدہ خاتون نے بتایا تھا کہ وہ لوگ رات کی ریل گاڑی سے ہمیشہ کے لئے دہلی چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں۔ اُس روز مہتاب کا بُرا حال تھا۔ وہ قابل رحم تھا۔ اُس دن وہ کتنا مغموم و پریشان رہا، بس وہی جانتا ہے۔ اُس نے اُنہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا، مگر لاحاصل۔ اُس دن سے اُسے شہناز کا انتظار تھا۔ اُسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اُسے ضرور ملے گی اور سچ مچ وہ مِل گئی۔ اب اسے اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ وقت عہد و پیان کو کتنی جلدی بُھلا دیتا ہے۔ پُرانی یادوں کے زخموں پر نمک پاشی اُسے نڈھال کئے ہوئے تھی۔ اس کے باوجود وہ خاموش تھا۔ کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔

آج شہناز کا جنم دن ہے۔ ہال سلیقہ سے سجایا گیا ہے۔ مہمان آنے شروع ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔ مہمانوں کے غول میں اُس نے کیک پر لگیں سالگرہ کی موم بتیوں میں پھونک مار کر اُنہیں بجھا دیا اور کیک کاٹ کر سالگرہ کی رسم ادا کی۔ کھانے سے فراغت پا کر سب لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ تحائف ہاتھوں میں لئے کمرے میں جاتے وقت وہ دیوار پر لگے قد آدم آئینہ کے روبرو ٹھٹکی۔ شہناز ایسی لگ رہی تھی، جیسے کالی بدلی میں تھرکتے ہوئے چاند کو واضح کرنے کے لئے سینکڑوں کی تعداد میں پُر ضیاء ستاروں سے شعائیں پھوٹ رہی ہوں۔

میز پر تحفے رکھ کر اُس نے اُنہیں کھولنا شروع کر دیا۔ ایک ایک کر تمام تحفے کھول ڈالے۔ اب صرف وہاب اور مہتاب کے دیے تحفے بچے تھے۔ وہاب کے دیے تحفے کے ڈبے میں قیمتی ساڑی کے علاوہ چھوٹے بچے کے کئی کھلونے موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر مسرت سے شہناز کا رواں رواں کھل اُٹھا۔ چہرے پر سُرخی کی تابناک لہر دَوڑ گئی۔ کون عورت ہے، جو ماں بننا نہیں چاہتی؟ آخر میں مہتاب کا تحفہ کھولا گیا۔ بطور تحفہ اُسے جو کچھ ملا، اُس سے اس پر سکتہ کا عالم طاری ہوگیا۔ پلکیں ساکت و جامد ہو کر رہ گئیں۔ آنکھیں پتھرا سی گئیں۔ وہ گم صم ڈبے کو دیکھے جا رہی تھی۔ ڈبے میں آسمانی

رنگ کا سوٹ تھا۔ سوٹ پر جگہ جگہ اسٹیل کے ستارے جگمگا رہے تھے۔ سوٹ کے بیچ میں گلابی رنگ کا کاغذ کا پھول رکھا تھا۔ کاغذ کے اس پھول کی پنکھڑیوں پر شہناز، شہناز لکھا تھا۔ سارا ڈبّہ آسمانی دُنیا محسوس ہو رہا تھا۔ سوٹ پر کاغذ کا رنگین پھول مثلِ مہتاب چمک رہا تھا۔ وہ دُور کہیں دُور کھو سی گئی۔ ماضی کے لچھوں میں اُلجھ کر اسے وہ تمام عہد و پیماں یاد آنے لگے، جو اُس نے کبھی مہتاب سے کئے تھے۔

شہناز دہلی کالج میں زیرِ تعلیم تھی۔ اس کی کلاس میں مہتاب نام کا نہایت ہی سادہ، شرمیلا طالب علم بڑی خاموشی سے آتا اور چھٹی کے بعد چپ چاپ لوٹ جاتا۔ دُنیا بھر کی باتوں سے بے نیاز اُس کا یہ معمول دیکھ کر شہناز کا دِل مہتاب سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ گول سفید چہرہ، سڈول بدن، ہپّی فیشن سے آراستہ گھنگرالے بال، نیچی قلمیں، اس کے دل و دماغ میں رچ بس گئیں۔ شہناز کا دل کلاس سے اُچاٹ رہنے لگا۔ وہ بہت جلد مہتاب سے گھل مل جانا چاہتی تھی۔ ایک روز اپنے گھر کے سامنے سے مہتاب کو گزرتے دیکھ اُس نے آواز دے کر اُسے بُلایا۔

مہتاب رُک گیا اور اس کے اصرار پر گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ فرصت کے لمحات نہ ہوتے ہوئے بھی اُس نے کافی دیر مہتاب کو اپنی باتوں میں اُلجھائے رکھا۔ چائے وغیرہ سے فراغت کے بعد کبھی کبھی آتے رہنے کا وعدہ کر کے وہ چلا گیا۔ کافی دنوں تک مہتاب نے اُدھر کا رُخ نہیں کیا۔ بعد میں شہناز کے اصرار پر کبھی کبھی آنے جانے لگا۔ دونوں خوب گھل مل گئے۔ بالآخر ایک دِن شہناز نے مہتاب کے جنم دن پر اُسے کاغذ کا رنگین پھول پیش کیا۔

پھول قبول کرتے وقت مہتاب نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''شنو! کاغذ کے پھول میں خوشبو نہیں ہوتی۔''

اس پر شہناز شرمندہ سی ہوگئی اور جواب میں بس یہی کہہ سکی۔ ''کاغذ کے پھول کو سوکھنے یا مرجھا جانے کا خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ کبھی خراب نہیں ہوسکتا۔''

مہتاب شرارتاً بول اُٹھا۔ ''تم حسن کا ایک ایسا مجسمہ ہو، جس پر کئی زندگیاں

قربان کی جا سکتی ہیں۔ تمہارا چہرہ چاند کو شرماتا ہے۔ تمہارے ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں کو جلا بخشتے ہیں۔ تمہارے بالوں سے گھٹائیں جنم لیتی ہیں۔ سورج کی کرنوں میں تمہارے حجاب و حیا کی چمک پائی جاتی ہے۔ تمہارے سفید دانت ستاروں کو شرمندہ کرتے ہیں۔ میں ان تمام خصوصیات سے اتنا متاثر ہوں کہ کبھی کبھی پاگل پن کا احساس ہونے لگتا ہے۔''

امتحانات ختم ہو گئے۔ مہتاب اب بھی جب تب شہناز کے گھر آتا جاتا رہا۔ دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کیا کرتے۔ ان کی باتوں میں شہناز کے ڈیڈی بھی مخل نہیں ہوتے تھے۔ کبھی کبھی کسی موضوع پر بحث بھی ہو جاتی۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ آخر کار کالج میں تعطیل کا اعلان ہو گیا۔

اس سے قبل کہ وہ مستقبل کے کسی منصوبہ کو آخری شکل دیتا، ماں کی بیماری کا تار آ گیا۔ تار پا کر وہ گھبرا گیا۔ اِدھر سات برس کی ناہید ٹھیک طرح سے ماں کی تیمارداری نہ کر سکی۔ گھر میں قدم رکھتے ہی مہتاب سیدھا ماں کے پاس پہنچا اور سلام کیا۔ ماں نے بیٹے پر ایک نگاہ ڈالی، پیار کی نگاہ! سلام کا جواب دینے کے لئے ان کے ہونٹ ہلے۔ اُنہوں نے زور سے کلمہ پڑھا۔ پھر آنکھیں بند کر لیں...... ایسا لگا جیسے وہ سو گئی ہوں...... کبھی نہ اُٹھنے کے لئے...... ابدی نیند!!

اُدھر شنو کے ڈیڈی آگرہ منتقل ہو گئے۔ وہاب ان کے اُوپر والی منزل میں رہائش پذیر تھا۔ وہ بھی شنو کے ڈیڈی سے خوب گُھل مل گیا تھا۔ آتے جاتے شنو سے بھی دُعا سلام ہونے لگی۔ لیکن آگرہ ان لوگوں کو راس نہیں آیا۔ ایک ہفتہ بعد جج صاحب حادثہ کا شکار ہو گئے۔ وہ وقت شہناز کے لئے کتنا مشکل اور صبر آزما تھا، بس وہی جانتی ہے۔ اتنے بڑے شہر میں وہ اکیلی تھی۔ دھیرے دھیرے وقت گزرتا رہا۔ وہاب کی ہمدردی، خلوص اور پیار کے سامنے وہ اپنا درد و غم بھولتی گئی۔ شہر میں کوئی ایسا نہ تھا جسے وہ اپنا کہہ سکے۔ زندگی کی ڈگر پر تنہا چلنے کے مقابلے اُس کے سامنے وہاب کے ساتھ شادی کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ اور آج...... جب اس کے دل کا

چین اُسے ملا تو وقت کے تیز قدم اپنی منزل سے دُور نکل گئے۔ بہت دُور...... اتنی دُور جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔

شہناز رو رہی تھی۔ اپنی مجبوری پر، اپنی قسمت پر۔ وقت کے سخت جان ہاتھوں کے سامنے وہ بے بس ہوگئی۔ کچھ نہ کرسکی۔ تنہائی کے خوفناک ناگ سے وہ بُری طرح گھبراگئی۔ وہ......

وہ گویا کہہ رہی ہو، "مہتاب! تم نے سچ کہا تھا کہ کاغذ کے پھول میں خوشبو نہیں ہوتی!!!

○○

(فروری ۱۹۷۴ء)

☆☆☆☆☆☆☆☆
☆☆☆☆☆☆☆
☆☆☆☆☆☆
☆☆☆☆☆
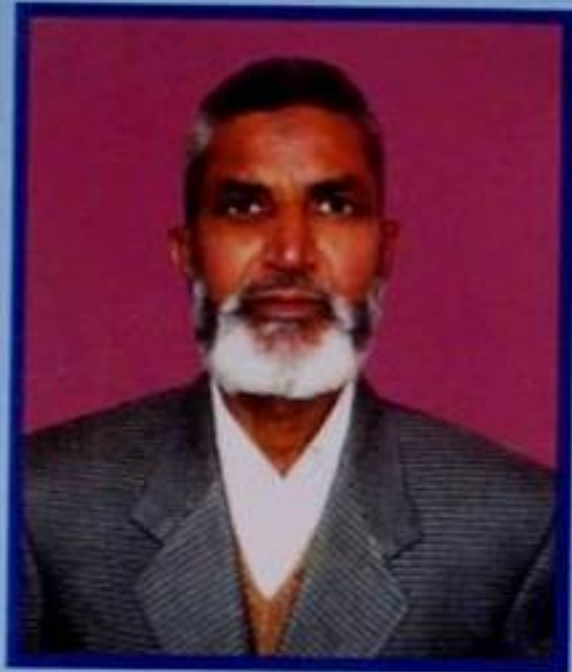
جناب ایم اے کنولؔ جعفری کی پیدائش ضلع بجنور کی تحصیل دھام پور کے قصبہ نینڈو خاص میں 2؍جنوری 1952ء کو ہوئی۔ ضلع بجنور کو ہمیشہ سے یہ فضیلت حاصل رہی ہے کہ یہاں سیاسی، سماجی اور ادبی ہستیاں نقشۂ وطن پر نیر اعظم کی طرح تابندہ رہی ہیں۔ جس کا ذکر کرنا یہاں ضروری نہیں۔ کنولؔ جعفری کا ادبی سفر کم وبیش پینتالیس برسوں پر محیط ہے۔ ان کا پہلا افسانہ ''طوفاں طوفاں ساحل'' فروری 1973 میں رسالہ 'خاتون مشرق' دہلی، میں شائع ہوا تھا۔ لیکن چند افسانے رقم کرنے کے بعد موصوف کا قلم چلتے چلتے رُک گیا، جس کی کئی وجوہات حائل رہیں۔ نتیجتاً تقریباً چار دہائی تک کنولؔ جعفری صاحب ادب کی دنیا سے بعید از بعید ہوتے گئے۔ زندگی کی اتھل پتھل اور نشیب وفراز نے موصوف کو یہ موقع نہ دیا کہ وہ ادب کے لئے کچھ وقت نکال لیتے۔ مگر جعفری صاحب کے لاشعوری خلیات میں جو جراثیم کنڈلی مارے برسہا برس سے بیٹھے تھے وہ فوراً ساز گار ماحول پا کر متحرک ہوگئے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ اندر پھیلتی ہوئی شگفتگی نے مناسب ہوا پانی ملتے ہی اپنی جڑے باہر نکالنی شروع کردیں۔ چنانچہ 2015ء سے از سرِ نو رسالہ 'ایوانِ اردو' میں بہ توسل افسانہ 'فرسودہ رواجوں کا درد'' ظہورِ تخلیق ہوا۔ اب ہندوستان کا ایسا کوئی رسالہ نہیں جس میں موصوف جلوہ افروز نہ ہوتے ہوں۔ 'فکرِ نو' (لاہور) رسالہ میں بھی ان کی کہانی زیورِ طبع سے آراستہ وپیراستہ ہو چکی ہے۔ زیرِ نظر افسانوی مجموعہ ''چاک کا بوسیدہ ٹکڑا'' موصوف کے کم وبیش نصف صدی کے ادبی سفر کا غماز ہے۔ اس میں پہلے اور دوسرے، دونوں دور کے افسانے شمولیت کے حامل ہیں۔ مذکورہ مجموعہ میں بیس کہانیاں ہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ ہر فنکار اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔ کنولؔ جعفری نے بھی اپنے افسانوں میں وہ پیش کیا ہے جس کے وہ چشم دید گواہ ہیں۔ وہ وقوع پذیر حادثات و واقعات کو بیانیہ کی شکل میں فن کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ ان کے قلم میں عصری حسیت بھی سانس لیتا ہے اور شکست وریخت ہوتی قدریں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ جہاں قاری کو کرب ودرد اپنی آغوش میں لے کر اسے غور وفکر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ''سونے پہ سہاگا'' یہ کہ کنولؔ جعفری ایک اچھے اور خوش فکر شاعر بھی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جعفری صاحب کا نصف صدی کا منضبط قوتِ مشاہدہ اور توجہ، احساس و ادراک کا مثلث زاویہ، افسانوں کی شکل میں قاری کو اپنی طرف متوجہ کرے گا۔

ڈاکٹر محمد مستمر

M. R. Publications

Printers, Publishers, Suppliers & Distributors of Literary Books

10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002
Cell: 09810784549, 09873156910 E-mail: abdus26@hotmail.com